مطبوعات مؤتمر المصنفین (۱۱)

روسی اِلحاد

پس منظر و پیش منظر

سوشلزم کے بدو آغاز، فکری نشوونما، جنگِ اقتدار، مظالم و چیرہ دستیوں
مذہب و اخلاق دشمنی، مغا پرستانہ ضعدری اور مستقبل کے ناپاک عزائم کا تحقیقی و تفصیلی جائزہ

از قلم

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

مدرس مدرسہ حسینیہ، نورک، شمالی وزیرستان

بسعی و اہتمام

مولانا سمیع الحق

مدیر "الحق"

مؤتمر المصنفین

دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

مطبوعات مؤتمر المصنفین (۱۱)

روسی الحاد

پس منظر و پیش منظر

سوشلزم کے بدء و آغاز، فکری نشو و نما، جنگِ اقتدار، مظالم و چیرہ دستیوں، مذہب و اخلاق دشمنی، ہٹ پرستانہ وضعداری اور مستقبل کے ناپاک عزائم کا تحقیقی و تفصیلی جائزہ

از قلم

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

مدرس مدرسہ حسینیہ، نورک، شمالی وزیرستان

بسعی و اہتمام

مولانا سمیع الحق

مدیر "الحق"

مؤتمر المصنفین

دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

★ کتاب :- روسی الحاد پس منظر و پیش منظر
★ تالیف :- مولانا الطاف الرحمان بنوی
★ ناشر :- مؤتمر المصنّفین
★ سلسلہ نمبر :- ١١
★ صفحات :- ١٩٥
★ مطبع :- عالمین پریس ریٹی گن روڈ لاہور
★ قیمت :- ١٢ روپے

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
١	پیش لفظ	٥	١٧	مزدوروں کی دوسری بین الاقوامی انجمن	٤٩
٢	عرض مؤلف	٧	١٨	روسی محنت کشوں کی بیداری	٥٠
	باب اول		١٩	زار شاہی استبداد کا سامنا	٥٣
٣	سوشلزم کے محرکات وعوامل	١٣/١٤		کشور کشائی کا جنون	″
٤	بگڑی ہوئی عیسائیت	١٥		مذہبی عدم رواداری	٥٧
٥	اہل یورپ کی علمی نامرادیاں	١٧		جنگل کا قانون	٥٨
٦	سائنسی ترقی اور صنعتی انقلاب	١٨		روسیت کا دیوتا	٦٠
٧	سرمایہ داری کے خلاف خالص انتقامی ردعمل	٢٠		معاشی استحصال	٦١
٨	سوشلزم ایک یہودی تحریک	٢٢		صدائے بازگشت	٦٣
	باب دوم		٢٠	مارکسزم کی انقلابی جدوجہد	٦٤
٩	سوشلزم کا فکری سفر	٣٠		لینن کا کارنامہ	″
١٠	معیشت سے الحاد تک	٣١		پہلی کانگریس کا انعقاد	٦٥
١١	اہل کلیسا کی تنگ نظری	٣٢		اسکارا اور دوسری کانگریس	٦٦
١٢	علوم طبیعہ کی ترقی کا منفی اثر	٣٤		گروہی کشمکش کا آغاز	٦٧
١٣	نجی ملکیت اور مذہب کا تلازمہ	٣٨		١٩٠٥ء کا انقلاب اور تیسری کانگریس	٦٨
١٤	مارکس کا مادی نظریۂ تاریخ	٤١		نقطۂ نظر کا اختلاف	٦٩
	باب سوم			مسلح بغاوت اور چوتھی کانگریس	٧٠
١٥	سوشلزم کی عملی سرگرمیاں اور جنگ اقتدار	٤٥/٤٦		بناؤ بگاڑ اور سخت گیری	٧١
١٦	عالمی انضباط کی مہم	٤٧		بالشویکوں کی جداگانہ پارٹی	٧٢

	نیا جوش نئے ولولے	۷۳		باب پنجم	
	چوتھی ڈیوما اور بالشویکوں کی شمولیت	〃	۳۱	مذہب و اخلاق دشمنی	۱۲۴/۱۲۵
	جنگ عظیم اور بالشویکوں کی بین الاقوامیت	۷۴	۳۲	مذہب کی تحقیر	۱۲۶
	معاشی بحران اور عوام کا غیظ و غضب	۷۵	۳۳	موقعہ شناسی اور مصلحت بینی	۱۲۹
	عارضی حکومت اور بالشویکوں کی چھٹی کانگریس	۷۷	۳۴	خدا کا انکار	۱۳۱
	بالشویک ابتلا کے نئے دور میں	۷۹	۳۵	اسلام کے خلاف معاندانہ مہم	۱۳۵
	نئی زندگی کا نیا کام	۸۰	۳۶	قرآن اور پیغمبر اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی	۱۴۲
	عارضی حکومت کا خاتمہ اور سرخ انقلاب	۸۲	۳۷	شعائر اسلام کی بابت دریدہ دہنی	۱۴۴
۲۱	پرولتاری آمریت کا قیام	۸۳	۳۸	چادر اور چار دیواری کی ہتک	۱۴۶
	باب چہارم		۳۹	مساجد کا انہدام	۱۵۲
۲۲	سوشلزم کی چیرہ دستیاں	۸۶/۸۷	۴۰	شعائر اسلام پہ پابندی	۱۵۵
۲۳	قول و فعل کا تضاد	۸۸	۴۱	دینی مدارس اور علماء کا حشر	۱۵۷
۲۴	سامراجی ہتھکنڈے	۹۰	۴۲	اخلاق کا انکار و تمسخر	۱۶۲
۲۵	ایدل اور ال	۹۲		باب ششم	
۲۶	شمالی قفقاز	۹۷	۴۳	سوشلزم کی مطلب آشنائی	۱۶۴/۱۶۵
۲۷	جزیرہ نمائے قرم (کریمیا)	۱۰۱	۴۴	پانچ یورپی نوآبادیاں	۱۶۶
۲۸	آذربائیجان	۱۰۴		کمیونسٹوں کا تسلط ـــ تین مرحلے	۱۶۷
۲۹	قازقستان	۱۰۶		سوویٹ طرز کا سیاسی نظام	۱۷۰
۳۰	ترکستان	۱۰۷		قوم پرستوں کی تطہیر	۱۷۲
	خوقند کی آزاد ریاست کا خاتمہ	۱۱۰	۴۵	چیکوسلواکیہ کی گوشمالی	۱۷۴
	خیوا (خوارزم) کی سرنگونی	۱۱۲	۴۶	ایران میں اثر و نفوذ	۱۷۸
	بخارا کا سقوط	۱۱۳	۴۷	روس اور افغانستان	۱۸۲
	ترکستان کی نئی تقسیم	۱۲۲	۴۸	پاکستان سوشلزم کا رہگذر	۱۸۸

پیش لفظ

سوشلزم اور اشتراکیت جو دراصل اخلاق و شرافت، عدل و انصاف، تہذیب و تمدن، الغرض انسانیت کے ہر مجد و شرف کے خلاف "بغاوت" کا دوسرا نام ہے۔ جس نے ظلم و استبداد، استعمار اور سامراجی عزائم کے لئے ایک دلفریب لبادہ، مساوات و حریت کی شکل میں اوڑھ رکھا ہے۔ لیکن مظلوم انسانوں اور آزاد و خودمختار ریاستوں پر آئے دن کمیونسٹوں کی یلغار اور شبخون مار کر ان کی آزادی اور انسانی مجد و شرف سلب کرنے کی ایک مسلسل تاریخ اس کے حقیقی رنگ و روپ کو سامنے لا چکی ہے اور اب حال ہی میں غیور و جسور مسلم افغانستان پر اس غاصب اور ظالم نظام کے علمبرداروں کے ہاتھوں جو گذر رہی ہے اس نے تو دنیا کے ہر انصاف پسند اور حساس انسان کو جھنجوڑ کے رکھ دیا ہے۔ اسلام کے زرخیز اور مردم خیز ریاستوں اور مراکز عظمت و شوکت کو ہڑپ کرنے کے بعد یہ عفریت اپنی سرخ اور خون آشام تلوار کے ساتھ افغانستان کی مسلم تاریخ کو مٹانے میں مصروف ہے۔ اور اس کے بعد مسلمانوں کے خون سے خون آلود یہ تلوار تحتی براعظم کی شہ رگ تک پہنچ گئی ہے۔ اور برصغیر کے مسلم فاتحین کی گذرگاہیں خیبر اور بولان خدانہ کرے عہد حاضر کے چنگیزی اور تاتاری دشمنانِ انسانیت روسیوں کے قدموں سے پامال ہونے والی ہیں ولا فعلہا اللہ۔ ایسے وقت میں جب کہ علم و عمل اور فکر و نظر ہر ممکن صورت میں جہاد اولین فریضہ ہے ہمیں بے حد خوشی ہے کہ دارالعلوم حقانیہ کے ایک ہونہار ذہین و فطین فرزند حضرت مولانا الطاف الرحمٰن صاحب بنوی نے روسی الحاد و استبداد کے محرکات و عوامل اس کی عملی سرگرمیوں اور ہوس اقتدار و استبداد کے ظالمانہ ہتھکنڈوں اور چیرہ دستیوں پھر اس کے مذہب بالخصوص اسلام اور اخلاق سے سے ظالمانہ اور معاندانہ طرز عمل پر اپنے اس مجموعہ میں سیر حاصل مواد اکٹھا کیا جس سے تمام مسلمانوں کو عموماً اور پاکستان و افغانستان کے شمال مغربی سرحدی علاقوں کے علماء، طلباء اور روسی کفر و الحاد سے برسرپیکار مجاہدین کو خصوصاً بے حد فائدہ ہوگا۔ جو کمیونزم کے اس بھیانک سیاہ تصویر سے کماحقہ آگاہ نہیں ہو سکے۔ اب ان معلومات کی روشنی میں وہ اور بھی شرح صدر کے ساتھ اور غیرت ایمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مؤلف

احقر ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۹۶۵ء میں دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا طالب علم رہا۔ اس سال دارالعلوم میں ماہنامہ الحق کے حسن آغاز کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد دو سال تک معراج العلوم بنوں میں رہ کر ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۹۶۸ء میں دوبارہ دارالعلوم حقانیہ میں داخلہ لیا۔ الحق اپنے معیاری مضامین اور پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہونا شروع ہو چکا تھا۔ میں اس رسالے میں اشتراکیت سے متعلق مولانا شمس الحق افغانی مدظلہ کی تحریرات کو بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اشتراکیت کے کمزور پہلوؤں پر ان کے ناقدانہ مضامین بلاشبہ بڑے بصیرت افروز ہوا کرتے تھے۔ اور میں ان سے خاصا متاثر ہو جایا کرتا تھا لیکن اشتراکیت کی اصل ماہیت اور اپنے دائرہ اثر میں اس کی دینی اور سیاسی تباہ کاریوں سے تاہنوز بے خبر رہا۔ نیز اس امر پر بار بار حیرت ہوتی تھی کہ کم از کم پاکستان کی حد تک اس غیر متعلق موضوع پر اتنی تحقیقات چہ معنی دارد۔ مگر بہت جلد ہی مولانا کی ان کاوشوں کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ جب پاکستان میں اشتراکیت کی بنیاد پر ایک بڑی سیاسی پارٹی کی تشکیل ہوئی۔ اور ملک کے طول و عرض میں انتہائی جاذب اور پرکشش نعروں سے اس کی طرف دعوت دی جانے لگی۔

۱۳۸۹ھ مطابق ۱۹۶۹ء کے رجب کے آخری ایام میں بندہ دورۂ تفسیر القرآن کی غرض سے راولپنڈی گیا مولانا غلام اللہ خان مدظلہ نے ابھی تک دورۂ تفسیر شروع نہیں کیا تھا۔ اس سے تا شروع دورہ ہفتہ عشرہ تک کئی دوسری کتابوں کا مطالعہ کیا۔ انہی دنوں روس کے سرخ اندھیروں سے متعلق کچھ کتابیں مطالعہ کے لئے ہاتھ آگئیں جنہیں بار بار پڑھا اور سوشلزم اور روسی سامراج کے خطرناک کردار اور پیش قدمی کا اس قدر احساس ہوا جس نے دل و دماغ کو بری طرح متاثر کیا۔ اس کے بعد سوشلزم کے موضوع پر لکھی ہوئی کچھ اور کتابیں مطالعہ کیں اور اب اشتراکیت کے نرغے میں محصور برادر اسلامی ملک افغانستان کا داخلی جائزہ لینا شروع کیا تو بہت جلد ہی یہ حقیقت مجھ پر علم الیقین کی حد تک منکشف ہو گئی کہ افغانستان

سے سرشار ہو کر کلمۃ اللہ کے اعلاء اور اس سرخ کفر کے تعاقب و استیصال میں حصہ لے سکیں گے۔ اس ضمن میں ضرورت ہے کہ اس کتاب کے ترجمے اور اس قسم کے دیگر مواد کو پشتو اور فارسی زبانوں میں شائع اور پھیلا دیا جائے۔

مؤتمر المصنفین کے لئے مسرت کا مقام ہے۔ کہ وہ اس اہم موضوع پر (جو وقت کا نہایت ہی اہم اور دینی تقاضا ہے) دارالعلوم ہی کے ایک ہونہار علمی فرزند کی قلمی کاوش پیش کر رہا ہے جو ایک عرصہ تک یہاں کے چشمہ علم سے فیض یاب ہو چکے ہیں اور جو ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ اور جو اپنے طالب علمی کے دور میں بھی اپنے علمی اور ادبی ذوق و شغف اور سلامت فکر سے اساتذہ کی محبت پا چکے ہیں۔ اور آج جب کہ بحمد اللہ عز و جل اس جہاد کے عملی محاذ پر، ان کی حقانی برادری کے حقانی فضلاء صف اول میں قائدانہ کردار اور صلاحیتوں کے ساتھ برسر پیکار ہیں اور سرخ روسی استعمار کے تعاقب و استیصال اور عملی جہاد میں دارالعلوم حقانیہ کے غیور فضلاء کا وہی کردار ہے جو دارالعلوم حقانیہ کے مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے عظیم فرزندوں کا مغربی اور یورپی استعمار و استبداد کے مقابلہ میں رہا۔ ایسے موقع پر آج ایک حقانی فرزند نے نظری، علمی اور فکری محاذ پر بھی ایک اہم ضرورت پوری فرما دی۔ فجزاہ اللہ عنا وعن جمیع المسلمین۔

امید ہے کہ یہ علمی اور تبلیغی کد و کاوش آگے چل کر ان کے مزید علمی و دینی خدمات جلیلہ اور ترقیات کا آغاز ثابت ہوگا۔ خداوند تعالیٰ اس کوشش کو بہترین نتائج کا ذریعہ بنا دے۔ اور روسی استعمار و استبداد کے خلاف یہ حقیر سی جد و جہد فاضل مؤلف کتاب، مؤتمر المصنفین، دارالعلوم حقانیہ اور خود اس گنہ گار کے لئے بھی موجب رضائے خداوندی و نجات و سرخروئی ثابت ہو۔ افسوس کہ خواہش کے باوجود مجھے کتاب کی کماحقہ ایڈیٹنگ اور نظر ثانی کا وقت نہ مل سکا تاہم مجھے فاضل مؤلف کے دینی درد اور موجودہ حالات کی فوری ضرورت اور تقاضوں کے پیش نظر یہ یقین ہے کہ موجودہ شکل میں بھی کتاب دینی لحاظ سے کارآمد اور مفید ثابت ثابت ہوگی۔ اور حق تعالیٰ الفاظ و معانی کی ظاہری بندشوں اور سیاق و سباق کی رعنائیوں کے لحاظ سے نہیں مقاصد و عزائم اور جذبات دینیات کے معیار سے اسے مقبول و بار آور فرما دیں گے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

والسلام
سمیع الحق
صدر مؤتمر المصنفین
۴ رجب ۱۴۰۰ھ

میں کمیونسٹ حکومت قائم ہونے والی ہے اور مشرقی بازو کٹ جانے کے بعد بچا کھچا پاکستان بھی نئے خطرات سے دوچار ہونے والا ہے۔ ایک سچے پاکستانی کی حیثیت سے سلامتیٔ وطن کی مساعی میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے فکر و عمل کے مختلف نقشے بنانے لگا۔ اور ایک عرصے تک ؎

منصوبے باندھتا ہوں، توڑتا ہوں، سوچتا ہوں
کبھی ایسا نہ ہو جائے کبھی ایسا نہ ہو جائے

کا مصداق بنا رہا۔ بالآخر "ماضی کا اجمالی خاکہ اور حال کی روشنی میں مستقبل کی بھیانک تصویر" کے عنوان سے برصغیر میں فرانسیسی سیاح واسکوڈے گاما کی آمد کے بعد سے پیش آنے والے وہ تمام اہم حالات و واقعات قلم بند کرنا شروع کئے۔ جن کے نتائج سے مستقبل کے امکانات پر روشنی پڑ سکتی تھی۔ اسی دوران معراج العلوم بنوں میں تدریس کی خدمت تفویض ہوئی۔ چنانچہ تدریسی اشتغال کے بیچ بیچ میں متذکرہ تحریری کام کو بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھاتا رہا۔

بہادر شاہ ظفر کی رنگون روانگی اور پورے ہندوستان پر غلامی کے منحوس تاریک سائے چھا جانے تک کے سلسلہ واقعات کو رقم کیا تھا کہ ایک مہلک بیماری کا شکار ہوا جس کے آثار ابھی تک محسوس کئے جاتا ہوں۔ یہ کام دھرا کا دھرا رہ گیا۔ تاہم کام کا احساس ختم نہیں ہوا تھا۔

انہی دنوں افغانستان میں سردار محمد داؤد کا انقلاب آیا۔ اس نے نئے عزم اور ولولے کے ساتھ پاکستان دشمنی کا آغاز کیا۔ اس سے سوئے ہوئے جذبات میں پھر تحریک پیدا ہوئی۔ چنانچہ کئی ہم خیال رفقاء کے ساتھ "تنظیم فدائین اسلام" کے نام سے عملی کام کا آغاز کیا۔ کئی مہینے کی سر توڑ کوشش کے بعد بمشکل چند ہی اور ساتھیوں کو صوبائی تعصبات کے خلاف اسلامی اخوت کی دعوت و تبلیغ کرنے کے لئے اس کام کی اہمیت کا احساس دلایا۔ اور پھر تنظیم کی طرف سے دو اشتہار بعنوان (۱) "سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد" (۲) "روسی اژدہا" اور تنظیم کے باقاعدہ لیٹر طبع کئے۔ لیکن اس پورے سلسلے کو صیغہ راز میں رکھا تاکہ مجلس عاملہ کی تشکیل اور تنظیم کا مرکزی حصہ قائم ہونے تک ہر قسم کی مخالفت سے محفوظ رہا جا سکے۔ ابھی تقسیم کار کا یہ مرحلہ طے ہونا باقی تھا کہ پورے ملک میں قادیانیوں کے خلاف ایک وسیع تحریک چلی اور ہر پاکستانی مسلمان کی توجہ اس اہم مسئلے کی طرف منعطف ہو گئی۔ ہم نے بھی تنظیمی کام کو سر دست ملتوی کر دیا تاکہ قادیانیوں کے خلاف مقامی جدوجہد میں کسی خلل اندازی کا باعث نہ بنے۔ یہ تحریک تو ایک بہتر اور حوصلہ افزا انجام پر پہنچ کر ختم ہو گئی۔

لیکن اس کے بعد سیاسی طور پر فضا ناساز گار ہو گئی۔ کیونکہ جماعتوں کی شدید مخالفت اور حکومت وقت کی طرف سے انتہائی سخت گیری کا قوی اندیشہ پیدا ہوا۔

ادھر اس نوخیز جماعت میں مخلصین کی تعداد اتنی دکھائی نہیں دے رہی تھی کہ چند ایک کے تعطل کے باوجود عوامی محاذ پر مثبت کام کا سلسلہ جاری رہنے کی توقع کی جا سکتی۔ ان مختلف مجبوریوں کے پیش نظر یہ تنظیم منصۂ شہود پر نہ آ سکی۔ اس منصوبے سے متعلق جو تحریری کام انجام پایا تھا۔ جمعیۃ علماء اسلام کے ہفتہ وار جریدے ترجمانِ اسلام لاہور میں "غلامیٔ ہند کی دلخراش کہانی" کے عنوان سے آٹھ قسطوں میں شائع ہوا۔

اس کے بعد احقر تدریس ہی کے سلسلے میں مدرسہ حسینیہ نورک شمالی وزیرستان آیا۔ یہاں معلوم ہوا کہ مولانا جلال الدین (حال رہنمائے حزب اسلامی افغانستان) افغانستان سے ہجرت کر کے میران شاہ (شمالی وزیرستان کے مرکزی مقام) میں سکونت پذیر ہیں۔ مولانا موصوف دارالعلوم حقانیہ میں میرے ہم درس رہ چکے تھے اپنی قابلیت اور حسنِ اخلاق کی بدولت میری عقیدت کے بھی مرکز تھے۔ میں فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان سے افغانستان کے تازہ حالات معلوم کر کے پہلے سے بھی زیادہ کوفت ہوئی۔ اس کے بعد تو بے شمار ایسے مہاجرین سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا جن کی دیانت اور ثقاہت پر کسی قسم کا شبہ کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ ان کے چشم دید واقعات سن کر وہ خدشہ بھی جاتا رہا جو اس سے پہلے مختلف موقعوں پر میرے دل میں آیا کرتا تھا۔ کہ مبادا اسوشلزم کی بابت وہ تمام تر تفصیلات جو میں نے کتابوں میں پڑھیں کہیں امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں کے پروپیگنڈے کا اثر اور اس نئے نظام کو بدنام کرنے کی شاطرانہ چال ہو۔ لیکن اب میرے ذہن سے اس قسم کا ہر شک و شبہ زائل ہو گیا۔

کچھ ہی دن گذرے تھے کہ سرخ انقلاب نے سردار داؤد کا تختہ بھی الٹ دیا۔ اور اب افغانستان پوری طرح سے روسی استعمار کے قبضے میں چلا گیا۔ ہمارا خیال تھا۔ کہ دنیا کے انصاف پسند ممالک اس انتہائی ظالمانہ اور سفاکانہ انقلاب کی سختی سے مخالفت کریں گے۔ اور یہ نہ ہو تو اسلامی دنیا تو حرکت میں آئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ لیکن ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا اور کسی طرف سے بھی تائید و تسلیم کے علاوہ کوئی مؤثر آواز سنائی نہیں دی۔ آخر کئی رفقاء کے ساتھ شمالی وزیرستان کے مشہور عالم دین مولانا دیندار صاحب مدظلہٗ فاضل دارالعلوم حقانیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بصد ادب عرض کی کہ وزیرستان کے لوگوں نے ہر شکل میں افغانی مسلمانوں کی امداد و اعانت کی ہے۔ شاید اس دھرتی کے مکینوں پر اس سے

پہلے ایسی کوئی اور مصیبت آئی ہو۔ جو آج ان کے سروں پر بجلی بن کر گری ہے۔ اس نازک اور سخت وقت میں ان کی حمایت اور اغیار کے ایجنٹ نام نہاد حکمرانوں کی مخالفت میں کم از کم جلسہ جلوس تو منعقد کیا جائے تاکہ اسلام کی مدافعت میں لڑنے والے ان نہتے مجاہدین کو اس قدر تو معلوم ہو کہ دنیا میں کوئی تو ان کے جہاد کو حق بجانب سمجھتا ہے۔ اور عالمی پیمانے پر ان کے حق میں آواز نہ اٹھنے کی وجہ ان کی قربانیوں کی ناقدری نہیں بلکہ صحیح حالات سے ناواقفیت ہے۔ پھر جن جن کو حقیقت حال کا انکشاف ہوتا جائے گا۔ بشرطِ انصاف بلا تامل ان کی تائید اور ممکنہ اعانت پر آمادہ ہو گا۔ نامناسب ہو گا اگر اس موقعہ پر مولانا کی اس دردمندی کا ذکر نہ کروں جو اس وقت اس نے ظاہر فرمائی۔ وہ ہمارے آنے سے پہلے ہی کافی متفکر اور مغموم تھے اور ہمارے ہی انداز سے سوچ رہے تھے۔ نیز اپنی پیشوایانہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کوئی مناسب اور مفید قدم اٹھانے والے تھے۔ انہوں نے چند ہی روز میں وزیرستان کے علماء کی ایک مشاورتی میٹنگ بلانے کا ارادہ ظاہر فرمایا اور پھر واقعتہً یہ میٹنگ بلائی۔ بعدہٗ عام مسلمانوں کو افغانستان کی صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لئے کئی عوامی جلسے منعقد کئے۔ اسی ہی سلسلے میں میں ایک دوسرے وزیرستانی پیشوا مولانا محمد گل منیر صاحب مدظلہ سے ملاقات کے لئے گیا۔ موصوف انگریزی اقتدار کے خلاف وزیرستانی مسلمانوں کی عرصۂ دراز تک رہنمائی کر چکے ہیں۔ دین دوست اور درویش منش بزرگ ہیں۔ اکثر اوقات خلوت اور گوشہ نشینی میں گزارتے ہیں۔ عصر کے بعد سے مغرب تک افغانستان ہی کے موضوع پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ اگرچہ سیاست سے لاتعلق ہیں لیکن پاکستان اور افغانستان کے سیاسی حالات اور مسائل سے بے خبر اور لاپرواہ بھی نہیں۔ دونوں مملکتوں کے مسلمانوں کے کسی بھی مشکل پر سخت مضطرب ہو جاتے ہیں۔ افغانستان کے نئے حالات سے کافی پریشان تھے اور وہاں کے مسلمانوں کی حتی الوسع امداد کی فکر کر رہے تھے۔

اس محفل میں احقر نے سوشلزم کے متعلق چند باتیں بیان کیں۔ جس پر انہوں نے بتاکید فرمایا کہ ان باتوں کو عام لوگوں تک پہنچنے کا انتظام ہونا چاہئے۔ میں نے اس عنوان پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جس پر انہوں نے نہ صرف تصویب بلکہ تحسین فرمائی۔ کتاب کی ضرورت کے احساس کے باوجود تدریسی مصروفیات اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے آغاز کی جرأت نہ کر سکا۔ تا آنکہ شعبان ۱۳۹۸ھ میں مدرسہ کی سالانہ چھٹیاں ہو گئیں اور میں حسب معمول رمضان گزارنے کے لئے لاہور گیا۔ یہاں کے

دورانِ قیام میں کئی ہم مجلسوں سے افغانستان کے ناگفتہ بہ حالات کا ذکر مذاکرہ ہوتا رہتا تھا۔ اسی ضمن میں اپنے ہاں کے وزیرستانی قبائلی مسلمانوں کی سوشلزم سے ناواقفیت کے پیش نظر کسی ایسی مختصر سی کتاب کی تصنیف کی ضرورت کا بھی اظہار کیا۔ جو سوشلزم کی ابتدائی تاریخ اور دین دشمنی کے بیان پر مشتمل ہو۔ ایک مخلص دوست میاں محمد عثمان صاحب نے آباد شاہ پوری کی کتاب "روس میں مسلمان قومیں" لا کر دی اور فرمایا کہ اس کا خلاصہ نکال کر آپ مقامی ضرورت پوری کر سکیں گے۔

رمضان المبارک کے بعد واپس مدرسہ آیا اور کام شروع کیا۔ لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ مجوزہ کتاب کی تصنیف کے لئے جو مواد درکار ہے وہ کسی ایک کتاب سے میسر نہیں ہو رہا۔ چنانچہ کام پھر تعویق و التوا کا شکار رہا۔ اس دوران وزیرستان کے کئی ذمہ دار افراد سے ملاقاتوں کا اتفاق پڑا جس سے یہ بات اور بھی زیادہ شدت سے محسوس ہوئی۔ کہ یہ لوگ افغانی انقلاب کے پس منظر اور پیش منظر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے بڑے بڑے نامداروں اور مقامی زعماء تک سے سنا کہ افغانستان کے نئے حکمران معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے اور کچھ معاشرتی اصلاحات کی فکر کر رہے ہیں بس یہی کچھ ان لاکھوں افراد کی ہجرت کا واحد سبب ہے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر غربت و مسافرت کی زندگی پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ کہنے والے دین و ایمان کو بیچنے والوں میں سے نہیں۔ مگر کابلی پروپیگنڈے کا شکار وہ خوش فہم افراد ہیں جنہوں نے اصل خطرے کا ادراک ابھی تک نہیں کر لیا ہے۔ ادھر یہ محرکات و مہیجات اور دوسری طرف مولانا گل منیر صاحب کے یکے بعد دیگرے پیغامات نے مجبور کر لیا۔ چنانچہ ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء رمضان المبارک کے مہینے میں لاہور میں دوبارہ کام شروع کیا۔ اور اسی کا ہو رہا۔ کتاب مرتب کرتے وقت آباد شاہ پوری کی "روس میں مسلمان قومیں"، خلیل احمد حامدی کی "سرخ اندھیروں میں"، محمد مظہر الدین صدیقی کی "اشتراکیت اور نظام اسلام"، صادق محمد حسن کی "اسلام اور اشتراکیت"، ہیوگ سٹین واٹسن کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ از جلیس عابدی اور ہمایوں ادیب کی کتاب "نیا سامراج" سامنے تھیں۔ چنانچہ انہی کتابوں کی مدد سے اس مجموعے کا اکثر حصہ رمضان ہی میں اور بقیہ حصہ صفر المظفر ۱۴۰۰ھ یعنی دسمبر ۱۹۷۹ء کے آخر تک مکمل ہوا۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ کتاب سوشلزم کے جملہ مفاسد پر حاوی نہیں۔ اس میں زیادہ تر توجہ تو دین و مذہب اور بالخصوص اسلام کے خلاف اس کے جارحانہ رویّے اور مشتے نمونہ خروار سیاسی مظالم کے بیان پر دی گئی۔ لیکن اس کے بدو آغاز اور نشو و نما کے مختلف مراحل کی ضروری تفصیلات کے بغیر نہ صرف بات ادھوری بلکہ ناقابل فہم بھی ہوتی اس

لئے تکمیل اور تفہیم سخن کی خاطر ان کا بھی اضافہ کیا گیا۔ سوشلزم کی معاشی اور معاشرتی خامیوں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بے شمار دینی مفاسد کا ذکر بہت تطویل کا موجب بن رہا تھا اس لئے اس کو مطلقاً ترک کیا گیا۔ میرے لئے یہ امر مزید افتخار و مباہات کا موجب ہے کہ میری یہ حقیر کاوش میرے اساتذہ بالخصوص میرے مشفق استاذ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب استاذ حدیث و تفسیر دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نے پسند فرمائی اور مسئلہ کی اہمیت و نزاکت کا احساس اور میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے میری تصنیفی زندگی کے اس نقش اول کو میرے مادر علمی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے وقیع اور مؤقر تصنیفی ادارہ مؤتمر المصنفین سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس میں میری عزت افزائی کے علاوہ کتاب کی استنادی حیثیت میں بے حد اضافہ ہوا۔ اور عام مسلمانوں میں اس کی مقبولیت اور قدر و قیمت اور افادیت کے امکانات روشن تر ہو گئے۔ وما ذلک علی اللہ العزیز

اللہ تعالیٰ اس حقیر سی کوشش کو اپنی رضا اور غلبۂ اسلام کا ذریعہ بنا دے۔

الطاف الرحمٰن بنوی
مدرسہ حسینیہ نورک۔ شمالی وزیرستان
مورخہ ۷ ر صفر المظفر ۱۴۰۰ھ

باب اوّل

سوشلزم کے محرکات و عوامل

جب سے دنیا آباد ہوئی ہے۔ انسان اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے اپنی فکری اور عملی قوتوں کو بروئے کار لا رہا ہے۔ خدا تعالیٰ کے نائب و جانشین ہونے کی حیثیت سے قدرت نے اس کو جزوی اختیار و تصرف کا حق اور کافی مواقع بہم پہنچائے۔ جو دراصل اس کے مقصدِ تخلیق ..... ابتلاء و آزمائش اور سعادت و شقاوت کی تقسیم ..... کے لئے لابدی اور ناگزیر تھے۔ کسبِ معاش کی جدوجہد میں ایک طویل عرصے تک یہی اصول کارفرما رہا کہ کامیاب تدبیر اور بار آور محنت و مشقت کا ماحصل فرد کی اپنی ملکیت ہے۔ جس کو اپنے حسبِ منشاء صرف کرنے میں وہ ہر طرح سے آزاد و خود مختار ہے۔ ہاں ان انتظامی اور اخلاقی ضابطوں کی پابندی بہر حال عائد رہی، جو افراد کو خود غرضانہ نفسانفسی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشرتی انتشار و ابتری سے بچانے میں ممد و معاون ہوں۔ مگر ایک وقت آیا، کہ شخصی ملکیت کے اس فطری اصول کو ناکارہ سمجھا جانے لگا۔ اور مندرجہ ذیل اسباب و وجوہ کی بنا پر اس کی جگہ ایک انتہائی نامعقول اور غیر فطری اندازِ فکر و عمل کو اپنانے کی کوشش کی گئی۔

بگڑی ہوئی عیسائیت

بلاشبہ ہر نبی اپنے زمانے کا نورِ ہدایت اور اس کی مکمل پیروی ترقیِ دارین کی ضمانت ہوتی ہے۔ وہ جس فکر و عمل کی طرف بلاتا ہے، ماحول اور حالات کی مناسبت سے وہی کامیابیوں سے ہمکنار ہونے کا واحد ذریعہ ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کا رسول زندگی کے بارے میں ناقص اور ادھورے تعلیمات دے کر انسانیت کو حیران و پریشان نہیں کرتا بلکہ تردد کے ہر چوراہے پر راہِ راست کی طرف رہنمائی کا وہ مقدس فرض سرانجام دیتا ہے۔ جو ہر لحاظ سے تسلی بخش اور چین قرار کا موجب ہو۔

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس کلیئے سے مستثنیٰ نہیں۔ بلاریب ان کی لائی ہوئی شریعت اپنے زمانے کا مکمل دستور العمل اور ضابطۂ حیات تھی۔ مگر تقدیرِ الٰہی کے اس اٹل فیصلے کو لامحالہ کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہونا ہی تھا کہ تمام گذشتہ ادیانِ سماویہ کی طرح دینِ عیسائیت بھی ایک مؤقت اور غیر دائمی دین ہے جس کی تعلیمات نے ایک زمانے تک صحیح رہنمائی کرنے کے بعد غیر مؤثر اور ختم ہونا ہے۔ چنانچہ عالمِ اسباب میں اس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دورانِ حیات اس کی تعلیمات کو سُنا تو گیا لیکن ان کی بقاء و حفاظت کا کوئی خاطر خواہ انتظام و اہتمام نہیں کیا گیا جس کا منطقی طور پر جو کچھ نتیجہ نکل سکتا تھا وہ نکل کر رہا۔ اور وہ یہ کہ دینِ عیسائیت کی اصل تعلیمات رفتہ رفتہ ناپید و نابود ہو گئیں۔ اور دنیا ایک دفعہ پھر جہالت و ضلالت کی تاریکیوں میں ڈوب گئی۔

حقیقت واقعہ تو یہ تھی لیکن اس کے علی الرغم رفع و صعود حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل بھی اور بعد بھی اس کے

نام نہاد عقیدت مندوں نے اناجیل کے نام سے اس کی طرف منسوب ارشادات و فرمودات کے نہایت ناقص اور غیر مستند مجموعے تیار کرنے شروع کیے جن کی تعداد دو بیسوں بیسیوں سے گزر کر سینکڑوں تک پہنچ گئی ان مجموعوں کا بہت کم حصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصل تعلیمات اور زیادہ تر حصہ ان کے اپنے مرتبین کے ظن و تخمین اور طبع آزمائیوں کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود عدید و ضخیم ہونے کے، حیاتِ انسانی کے اکثر گوشوں میں یا تو سرے سے کچھ کہنے بتلانے سے قاصر اور خاموش رہے اور یا اگر ایک آدھ نے کہیں کچھ لب کشائی کی بھی تو صد درجہ ناقص اور ناکافی۔ لیکن عیسائی دنیا انہی انسانی دفاتر کو الہامی صحیفے سمجھتی رہی اور ان کو وہی وقعت و اہمیت دیتی رہی جو فی الواقع پیغمبرانہ تعلیمات کو دینی چاہئے تھی[1]

---

[1] مسیحیت کی تحریف اس کے دورِ آغاز یعنی پہلی صدی مسیحی کے نصف ہی سے شروع ہوئی تھی وہ ایک صاف اور سادہ توحیدی مذہب سے ایک ایسے مشرکانہ مذہب میں تبدیل ہو گئی جس کو یونانی اور بودھ افکار و خیالات کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سب سے بڑے داعی اور پیرو سینٹ پال (۱۰ - ۶۵ء) کے ہاتھوں ہوا۔ یہ تبدیلی دراصل ایک روح سے دوسری روح ایک شکل سے دوسری شکل اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف ایک ایسی جست یا چھلانگ کے مترادف تھی جس میں پہلی شکل سے صرف نام اور بعض رسوم کا اشتراک باقی رہ گیا۔ ایک مسیحی فاضل DE BUNSEN IERUS اس تغیر و انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

جس عقیدہ اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے اس کی دعوت حضرت مسیحؑ نے اپنے قول و عمل سے کبھی نہیں دی تھی اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو نزاع قائم ہے اس کی ذمہ داری حضرت مسیح علیہ السلام کے سر نہیں بلکہ یہ سب اس یہودی ایسائی بے دین پال کا کرشمہ ہے۔ نیز صحف مقدسہ کی تمثیل و تجسیم کے طریقے پر تشریح اور ان صحیفوں کو مثالوں اور پیش گوئیوں سے بھر دینے کا نتیجہ ہے۔ پال نے اسٹیفن (STEPHEN) کی تقلید میں جو مذہب ایسانی (ESSENIO) کا پیرو تھا حضرت مسیح کے ساتھ بہت سی بودھ رسمیں وابستہ کر دیں۔ آج انجیل میں جو متعدد کہانیاں اور روایات ملتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کو ان کے مرتبے سے بہت فروتر شکل میں پیش کرتے ہیں وہ سب پال کے وضع کئے ہوئے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے نہیں بلکہ پال اور ان کے بعد آنے والے پادریوں اور راہبوں نے اس سارے عقیدے و نظام کو مرتب کیا ہے جس کو آرتھوڈکس مسیحی دنیا نے اٹھارہ صدیوں سے اپنے عقیدے کی اساس قرار دیا ہے۔

(ماخوذ از تاریخ دعوت و عزیمت ج ۱۔ مصنفہ ابوالحسن ندوی)

ایک طرف تو اناجیل کے استناد کا یہ حال رہا، اور دوسری طرف ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں عرب کے افق سے نبی آخر الزماں محمد ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نئی نبوت طلوع ہوئی جس نے عیسائیت سمیت تمام ادیان سابقہ کے منسوخ ہونے کا اعلان کیا۔ اور نئی دنیا کے نئے حالات کا سامنا کرنے کے لئے اسلام کے عنوان سے نئی تعلیمات پیش کیں جو مقدس عیسائیت کے نام سے رائج خود ساختہ اور من گھڑت تعلیمات کی طرح اپنی کوتاہ نظری اور تنگ دامنی کی شاکی نہیں۔ بلکہ اعلیٰ جامعیت اور عالمگیریت کی حامل تھیں۔

طلوعِ اسلام کے بعد عیسائیت کی اصل تعلیمات بھی اگر موجود ہوتیں تو بہر حال ناکافی اور ناقابلِ عمل ہوتیں کہ ان کے لئے قدرت کی حکمتِ بالغہ کا مقررہ و مجوّزہ وقت بیت چکا تھا۔ اور اب ان کو زندگی کے معاملات میں فیصل سمجھنے اور اس کے تحت ان کو نافذ کرنے کی کوشش سراسر ناحق اور باطل تھی۔ چہ جائیکہ افترا پردازوں کی فکری کد و کاوش اور ذہنی اختراعات ملتفی ہو جاتیں۔ چنانچہ عیسائیت ٹھیک ٹھیک "کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا" کی مصداق بنی جو اس وقت کی مطلوبہ ہدایت و راہ نمائی فراہم نہ کر سکی۔ نتیجۃً زندگی کے تمام معاملات میں عموماً اور اس کے اہم ترین شعبۂ معیشت میں خصوصاً وہ بگاڑ رونما ہوا جس کی وجہ سے اس وقت کا انسان رائج الوقت معاشی طرز و طریق سے مطمئن نہ ہو سکا۔ اور کسی دوسرے متبادل راستے کی تلاش کی ضرورت محسوس کی۔

اہلِ یورپ کی عملی نامرادیاں

ہر چند کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی بیشتر تعلیمات مٹ گئی تھیں اور ان کے نافذ العمل رہنے کا وقت بیت چکا تھا۔ تاہم ان کے اندر اس قدر دم خم پھر بھی تھا۔ کہ اگر یورپی دنیا انہی کو حقیقی معنوں میں عمل کا مدار ٹھہراتی تو اگرچہ وہ قابلِ رشک اور عمدہ معاشرت تو وجود میں نہ آتی جو حقیقتاً خدائی احکام کے بروقت نفاذ سے ممکن ہے لیکن اتنا ضرور ہوتا کہ معاشی ناہمواریاں اس حد تک قطعاً نہ بڑھتیں جس سے گھبرا کر کوئی بھی انسانی آبادی ایسی اشتراکیت قبول کرتی جو انسانی فطرت کے ساتھ کسی طور بھی ہم آہنگ نہیں۔

اہلِ یورپ کہنے کو تو عیسائی اور ان مجموعۂ اناجیل کو ماننے والے تھے جو ان کے ہاں کتب سماوی کی حیثیت سے معروف تھا لیکن عملاً ان کے مندرجات سے بہت دور اور قطعاً آزاد و بے پروا تھے۔

یہ کتابیں اگرچہ تقسیم ثروت کے کسی جامع منصوبہ بندی اور تفصیلی پروگرام سے خالی تھیں تاہم ان میں

کچھ اخلاقیات بالخصوص رحم و ہمدردی اور عفو و درگزر سے کام لینے پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اناجیل کی تعلیم میں دنیا سے فرار اور کامل بے رغبتی کی تلقین ایک مرکزی نقطے کی حیثیت سے شامل تھی۔ جس کے فروغ پر عمل کرنے سے ناجائز تموّل کا دور دور تک احتمال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ عیسائیت اگر تمام لوازم و متعلقات کے ساتھ رو بہ عمل ہوتی تو سرے سے تمدن ہی کی بنیادیں ہل جاتیں اور یورپ کا کوئی بھی شخص بڑے پیمانے پر ادخارِ دولت تو کیا کرتا قوت لایموت سے زیادہ لینے کا روادار تک نہ ہوتا۔

مگر ایسا نہیں ہوا، تام نہاد عیسائیوں نے اسلامی تعلیمات کو ٹھکرانے اور مسترد کرنے کے بہانے کی حد تک تو عیسائیت کے وجود کو تسلیم کیا۔ لیکن حصولِ معاش کے سلسلے میں اپنی اہواء و خواہشات پر اس کی کوئی اخلاقی پابندی قبول نہیں کی۔ پیداواری وسائل کے مالکوں نے محنت کشوں کا استحصال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جاگیردار و سرمایہ دار خود تو بڑی وسعت اور فراخی سے عیش و عشرت کی زندگی گذارتے رہے۔ لیکن زندگی کی بنیادی ضروریات تک کے لئے ترسنے والے کسانوں کی کوئی خبر گیری نہیں کی۔ نتیجۃً معاشرہ دو ایسے متفاوت گروہوں میں بٹ گیا جس میں سے ایک گروہ تمدن کا بڑا ستون ہونے کے باوجود دوسرے چھوٹے ستون کا دستِ نگر رہا۔ اُلٹی گنگا کے اسی صورتِ حال نے اشتراکی خیالات کے لئے راستہ ہموار کیا۔

سائنسی ترقی اور صنعتی انقلاب

اس بچے کھچے مذہب کی ڈھیلی گرفت انسانیت کی تنظیم میں بُری طرح ناکام ہو چلی تھی۔ اور یورپی معاشرہ ایک بالکل ہی غیر فطری راستے پر گامزن تھا۔ زمین اس وقت کا سب سے بڑا معاشی ذریعہ تھا جو جاگیری نظام کے تحت معدودے چند خوش نصیبوں یا خوش تدبیروں میں منقسم تھی۔ اونچا طبقہ جاگیرداروں کی اقلیت اور نچلا طبقہ وہ محروم القسمت اکثریت تھی جس کو خدا کی زمین میں سے قدرِ واجب بھی نہیں مل سکا تھا۔ مالداروں کی دولت و ثروت میں روز افزوں ترقی اور ناداروں کی غربت و افلاس میں انحطاط و تنزل کا عمل جاری ضرور تھا لیکن اس عمل کی رفتار بہت سُست تھی اور اعلیٰ و ادنیٰ کے بیچ میں حائل بُعدِ منافرت کا خلیج نظر بمابعد زیادہ سے زیادہ وقت میں کم سے کم قطع مسافت کے اصول پر پھیلتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک سائنسی انکشافات کا وہ ہنگامہ خیز دور شروع ہوا جس نے صنعت و حرفت کی دنیا ہی بدل

دی اور اکتنازِ سرمایہ کی ایسی ایسی محیر العقول راہیں کھول دیں جن کی وجہ سے امراء و غرباء کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ قطعِ مسافت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے دور و متفاوت اور اس کے نتیجے میں متنفر ہونے لگے اور یوں طبقاتی کش مکش نے پہلے سے زیادہ خطرناک صورت اختیار کر لی۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سائنسی آلات اور مشینوں کی دریافت سے پہلے زرعی اراضی ہی اقتصادی خوش حالی کی کنجی سمجھی جاتی تھی۔ صنعتی میدان میں محدود پیمانے پر گھریلو دستکاری کا رواج ضرور تھا مگر وسیع بنیادوں پر صنعتی کاروبار تا ہنوز رائج نہ ہو سکا تھا۔ بہر حال جاگیردار تھا یا چھوٹا موٹا صنعت کار، ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر کارکنوں کا زیادہ سے زیادہ محتاج تھا۔ یہ دونوں کامیاب پیداواری مہم چلانے کے لئے مناسب مقدار میں اچھے سے اچھے کاشتکاروں اور مزدوروں کا انتظام کرتے جن پر ان کے اپنے منافع کا ایک خطیر حصہ اجرتوں میں صرف ہو جایا کرتا تھا۔

مشینوں کا دَور چلا، تو کم سے کم لاگت میں زیادہ سے زیادہ منافع بٹورنے کا بہت سُستا طریقہ ہاتھ آیا۔ چنانچہ زندگی کے ہر میدان میں عموماً اور صنعتی مراکز میں خصوصاً مشینوں پر زیادہ سے زیادہ اور محنت کشوں پر کم سے کم انحصار کیا جانے لگا۔ مارکس اپنی کتاب "کیپیٹل" میں برطانوی پارلیمنٹ کے سرکاری ریکارڈ کے حوالے سے لکھتا ہے:۔

" بھاری تعداد میں ذرائع آب پاشی کا استعمال، گھوڑے پالنے کے نئے طریقے اور سبز فصلوں کی مصنوعی کاشت، مشین کے ذریعے کھاد ڈالنے کے طریقے، اراضی کو مختلف طریقوں پر تیار کرنے کے ذرائع اور کیمیاوی کھاد کا اعلیٰ پیمانے پر استعمال۔ سٹیم انجن کا استعمال اور قسم قسم کی نئی مشینری استعمال میں لانے اور کاشت کو حد سے زیادہ بڑھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ کاشت کے کام میں مزدوروں کی کھپت کم ہو گئی۔ ۱۸۵۱ء میں ان کی تعداد ۳۹۶، ۴۱، ۱۲ تھی۔ ۱۸۶۱ء میں یہ گھٹ کر ۲۱۷، ۶۳، ۱۱ ہو گئی"[1]

پیداواری تگ و دو کا یہ مشینی نظام اپنے جلو میں بے شمار نقائص و معائب ساتھ لے کر آیا۔ اس نئے نظام کی بدولت وسیع بنیادوں پر صنعت کاری کا آغاز ہوا۔ بڑی بڑی فیکٹریاں اور ملیں بننے لگیں۔ رفتارِ کار میں

---

[1] کیپٹل جلد ۱ صہ ۶۷۷

بڑی تیزی اور بلاخیزی پیدا ہوتی۔ کم خرچ پر مشینوں کی تنصیب سے کارخانہ داروں اور مل مالکوں کی تجوریاں بھرنے لگیں۔ لیکن غریب محنت کشوں کی گزر بسر پہلے سے بھی زیادہ سخت اور ان کی زندگیاں مخدوش تر ہوئیں۔ اسٹیم کی طوفانی قوتوں کے کامیاب استعمال سے اولاً تو کارخانوں میں مزدوروں کی ضرورت ہی بہت کم رہی اور جو تھوڑی بہت رہی بھی، تو مشینی دور کی لائی ہوئی عام بے روزگاری نے کارخانہ داروں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ کم سے کم من مانی اجرتیں مقرر کر کے اس ضرورت کو بڑی آسانی سے پورا کریں اور محنت کشوں کے مفادات سے کھیل کر بھی کوئی کاروباری حرج محسوس نہ کریں۔ مارکس صنعتی مزدوروں کی بدحالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے۔

"صنعتی مزدوروں کی حالت دل گداز تھی۔ بے چارے بے سہارا مزدوروں پر بڑے بڑے صنعت کاروں کی طرف سے سخت ظلم اور تشدد روا رکھا جاتا تھا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ موت کے دہانے پر جا پہنچے تھے۔ کوڑے لگائے جاتے اور انہیں بیڑیاں پہنائی جاتی تھیں اور طرح طرح سے انہیں ایذا دی جاتی۔ بھوک کے مارے وہ ہڈیوں کا ایک پنجر بن جاتے تھے۔ لیکن انہیں کوڑے لگا کر کام کرنے پر آمادہ کیا جاتا۔ بعض اوقات وہ تنگ آ کر خودکشی کر لیتے۔"[1]

نتیجتہً امیری و غریبی دو ایسی انتہاؤں پر پہنچ گئیں جن کو دیکھ کر انسانوں کے ان دو قسموں کے درمیان انسانی اشتراک کا تصور دھندلا جاتا۔ اور یہ بین حقیقت ایک بے اصل مفروضہ دکھائی دینے لگتا۔ اسی ناقابل برداشت اونچ نیچ نے نچلے طبقوں کو کوئی ایسی تدبیر سوچنے پر مجبور کیا جو سرمایہ داری کے ان مفاسد کا قلع قمع کر سکے۔ سوچ و فکر کا یہی انداز کچھ دوسرے عوامل کے ساتھ مل کر بالآخر سوشلزم پر منتج ہوا۔

سرمایہ داری کے خلاف خالص انتقامی ردِ عمل

نفس انسانی کا خاصا ہے کہ جب وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے متاثر ہو کر فکری عمل کا آغاز کرتا ہے تو اس کی فکر اس کو انتہا کے دوسرے سرے پر پہنچا دیتا ہے۔ زمانے کے عام میلان سے بیزار ہو کر اس کا ذہنی رجحان بالکل مخالف راہ اختیار کر لیتا ہے۔ اور جن اقدار (VALVES) کو وہ عمرانی زندگی پر حکمران پاتا ہے

---

[1] کیپٹیل جلد اص ۵۰

انہیں الٹ پلٹ کر بالکل مخالف اقدار ترتیب دینا شروع کر دیتا ہے۔ غرض اس کی فکر غیر شعوری طور پر جذبۂ نفرت اور باغیانہ ہیجان سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔

سوشلزم بھی انسانی فطرت کی اسی کمزوری سے برآمد ہوا اور اپنے عہد کے معاشی مظالم کو دیکھ کر ایک دوسری انتہا پر پہنچ گیا۔ صداقت کی طرف راہ نمائی کرنا تو کجا اس قسم کا فکری عمل بسا اوقات انسان کو اور زیادہ گمراہی میں پھنسا دیتا ہے۔ اور نئی نئی مشکلات و مصائب سے دوچار کر دیتا ہے۔

یورپ میں مشینی نظام کی ترویج سے ایک طرف تو دولت و ثروت کی مناسب گردش رک گئی اور بڑے پیمانے پر ناجائز اکتناز کا دور دورہ شروع ہوا اور دوسری طرف اسراف اور اظہارِ تموّل کے انتہائی دلفریب مظاہر رونما ہوتے۔ آرام و آسائش اور آرائش و زیبائش کے نت نئے ساز و سامان بننے اور بازاروں میں بکنے لگے۔ جن کی وجہ سے زندگی کی رعنائیوں اور رنگینیوں اور پھر اس کی دلکشیوں اور دلچسپیوں میں خاصا اضافہ ہوا۔ مگر اقلیت نے اکثریت کا خون چوس چوس کر دولت کے انبار لگاتے اور اس کے بل پر تعیش کے ہر نئے ڈیزائن سے بھرپور استفادہ کیا۔ جب کہ اکثریت ہر قسم کی لذتوں سے محروم رہی اور بیچاری قسمت کی ماری پہلے کی طرح اب بھی زندگی کی اس نئی گہما گہمی میں سے کوئی حصہ نہ پا سکی۔ مارکس کا بیان ہے:۔

"غیر جانب داری سے حالات کا جائزہ لینے والا معلوم کر سکتا ہے کہ ذرائع پیداوار کو جس قدر مرکزیت حاصل ہوتی جاتی ہے اُسی قدر مزدوروں کو ایک جگہ پر ریوڑ کی صورت میں اکٹھا کر دیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح جس قدر تیزی سے سرمایہ اکٹھا ہوتا ہے اسی قدر مزدوروں کی جائے رہائش تکلیف دہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ شہروں کی سجاوٹ جس کا تعلق دولت کی فراوانی کے ساتھ ہے اور جس کا اہتمام بوسیدہ تعمیرات کو گرا دینے سے کیا جاتا ہے۔ بینکوں کے لئے عالیشان عمارات کی تعمیر، گوداموں کی تعمیر، تجارتی آمد و رفت کے لئے سڑکوں کی توسیع جو سامان تعیش کی نقل و حمل کے لئے ضروری ہوتی ہے اور ٹراموے کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ ان سب ترقیات کا اثر یہ ہوتا ہے کہ غریب کو اور زیادہ گنجان آباد نکمین گاہوں کی طرف ہانک دیا جاتا ہے۔"

(کیپٹیل جلد اص ۶۵۰)

مارکس ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے:

"یہی حالت دوسرے مزدوروں کی ہے جو اینٹیں بناتے ہیں، چونا بناتے ہیں یا ریلوے کی تعمیرات میں کام کرتے ہیں۔ وہ خانہ بدوش ہوتے ہیں وہ جہاں بھی جاتے ہیں چیچک، ہیضہ اور دوسری وباؤں کا ایک دستہ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کی رہائش کے لئے ٹھیکیدار چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا دیتے ہیں جہاں نکاس پانی اور روشنی کا ہرگز کوئی انتظام نہیں ہوتا اور پھر ستم یہ کہ لاتعداد مزدوران میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ چیچک کی وبا اور اموات بھی ٹھیکے داروں کو ان کی حالت بہتر بنانے پر مجبور نہیں کر سکتیں" (کیپٹل جلد اصہ ۶۶۳)

ایک طرف تو بلند و بالا کوٹھیوں، زرق برق کے لباسوں اور انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کی ضرورت سے زیادہ بہتات اور فراوانی رہی۔ اور دوسری طرف گھاس پھونس کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں۔ پھٹے پرانے چیتھڑے اور روکھی سوکھی روٹی بھی آسانی سے میسر نہ تھی۔ اب غربا کی محرومیاں زیادہ سے زیادہ عیاں و نمایاں ہوئیں اور امرا کے فخر و مباہات کے پے در پے ضربوں کے سامنے ان کے احساسات کے نازک آب گینے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ شدید ترین احساسِ محرومی نے ناداروں کے دلوں میں مالداروں کے خلاف بُغض و عداوت کا بے حد و حساب زہر بھر دیا اور انتقامی جذبات کا ایک بے پناہ طوفان اُمڈ پڑا۔ جذبات کے اس اشتعال و انگیخت نے طبقاتی کش مکش سے نمٹنے کی کوئی مناسب اور معتدل حل ڈھونڈنے کی بجائے ایک ایسا مفرطانہ اور خالص منتقمانہ راستہ اختیار کیا۔ جس میں بھلے بُرے کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی ہو۔ سوشلزم جلے ہوئے لوگوں کے اسی غیض و غضب کی صدائے بازگشت تھی۔

سوشلزم ایک یہودی تحریک

سیدنا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں میں سے چوتھے بیٹے کا نام یہودا تھا۔ اسی سے بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں کا ظہور ہوا۔ یشوع کے زمانے میں مفتوحہ علاقہ انہی لوگوں کے درمیان تقسیم ہوا اس تقسیم میں ارشلیم سے لے کر اس کے جنوب کا تمام علاقہ بنی یہودا کے حصہ میں آیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اسی خاندان سے تھے ان کے زمانے میں تمام سلطنت بنی اسرائیل ان کے قبضے میں آئی جس سے اس خاندان کی عظمت اور شوکت کو چار چاند لگ گئے۔ ان کے بعد ان کے وارث حضرت سلیمان علیہ السلام ہوئے جنہوں

نے اپنے دارالسلطنت میں ہیکل کی تعمیر کی۔ اس سے بنی یہودا کی عظمت میں مزید اضافہ ہوا۔[1]

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے۔ اور یہ پوری قوم دو حصوں میں بٹ گئی۔ جس کے نتیجے میں شمالی فلسطین اور شرق اردن میں اسرائیل اور جنوبی فلسطین اور اَدُوم کے علاقے میں یہودیہ کی دو الگ الگ سلطنتیں قائم ہوئیں جن کے پایۂ تخت علی الترتیب سامریہ اور یروشلم قرار پاتے۔ بعد کی تاریخ میں یہودیہ اور اسرائیل دو ہی نام آتے ہیں۔ پھر جب یہ لوگ کلدانیوں کی اسیری میں مبتلا ہوئے تو تمام بنی اسرائیل کے لئے یہود کا لفظ ایک مشترک نام کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔[2]

یہ نسل ایک بہت پرانی تاریخ اور عجیب و غریب روایات کی حامل ہے۔ ایک طرف تو اس کی آغوش انبیاء و رُسل اور بڑے بڑے عابدوں، زاہدوں سے مالا مال اور آباد ہے۔ اور دوسری طرف خبثِ باطن اور ہر قسم کی بدروی کا آغاز بھی یہیں سے ہوتا رہا ہے۔

سید انبیائے بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانۂ ولادت، طفولیت اور آغازِ نبوت میں ان کی قومی پستی اور ادبار کا کیا حال تھا۔ پھر ان کے فیض و برکت سے شرف و فضیلت کی کیا کیا خصوصیات پائیں؟ قرآن پاک کے لافانی اوراق میں اس کی ضروری تفصیلات موجود ہیں۔ پھر اس کے بعد سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی تک کے حالات و واقعات کو پڑھئے اور ان کے قومی سیرت و کردار کا جائزہ لیجئے آپ کو معلوم ہوگا کہ حضورِ حق میں بے ادبیاں اور گستاخیاں اور انبیاءؑ کی بے باکانہ دل آزاریاں اور بے رحمانہ خوں ریزیاں ان کا طرۂ امتیاز رہا۔ تبدیلِ احکام اور تحریف آیات الٰہی جیسے عظیم الشان جرائم کا ارتکاب ان کے اسلاف و اخلاف کا محبوب مشغلہ رہا۔ تلوّن مزاجی، ابن الوقتی بدترین قسم کی خود غرضی اور مکر و فریب ان کی قومی شخصیت کی وہ جانی پہچانی علامتیں جن سے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کسی دَور میں بھی خالی نہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں رسوا و بدنام اور اکثر و بیشتر خالق و مخلوق کی طرف سے معتوب و مغضوب رہے۔

۷۲۱ ق م میں اشور کے سخت گیر فرماں روا سارگون نے اسرائیلی سلطنت کے پایۂ تخت سامریہ کو فتح کر کے دولت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا۔ ہزارہا اسرائیلی تہہ تیغ کئے گئے۔ ۲۷ ہزار سے زیادہ بااثر اسرائیلیوں

---

[1] [2] تدبر قرآن حصہ اول از مولانا امین احسن اصلاحی۔

کو ملک سے نکال کر اشوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں تتر بتر کر دیا گیا۔ ۵۸۶ء ق م میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے بنی اسرائیل کی دوسری سلطنت یہودیہ پر ایک سخت حملہ کر کے اس کے تمام بڑے بڑے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پیوند خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی۔ یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر مختلف ممالک میں منتشر کر دیا۔ اور جو یہودی اپنے علاقے میں رہ گئے وہ بھی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں بُری طرح ذلیل اور پامال ہو کر رہے۔ ۵۳۹ء ق م میں ایرانی فاتح سائرس نے بابل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے بنی اسرائیل کو اپنے وطن جانے اور وہاں آباد ہونے کی اجازت دی۔ چنانچہ یہودیوں کے قافلے یہودیہ کی طرف جانے شروع ہو گئے۔ (تفہیم القرآن جلد ۲)

۵۲۲ء ق م میں دارا یوس اول نے یہودیہ کے آخری بادشاہ کے پوتے زروبابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا جس نے حجی نبی، زکریاہ نبی اور سردار کاہن یشوع کی نگرانی میں ہیکل مقدس نئے سرے سے تعمیر کیا۔ ۴۵۸ء ق م میں حضرت عزیر علیہ السلام اور ۴۴۵ء ق م میں نحمیاہ کے زیرِ قیادت یہودیوں کے اور کئی جلاوطن گروہ یہودیہ میں آ کر آباد ہوئے۔ حضرت عزیر علیہ السلام نے دین موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام سرانجام دیا۔ انہوں نے یہودی قوم کے تمام اہلِ خیر و صلاح کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ شاہ ایران نے نحمیاہ کو یروشلم کا حاکم مقرر کر کے اس امر کی اجازت دی کہ وہ اس کی شہر پناہ تعمیر کرے۔ اس طرح ڈیڑھ سو سال بعد بیت المقدس پھر سے آباد ہوا۔ (تفہیم القرآن جلد ۲)

ایرانیوں کے بعد رومیوں کا دورِ عروج آیا۔ ۶۳ء ق م میں رومی فاتح پومپی نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ ۴۰ء ق م میں رومیوں کی قائم کی ہوئی یہ فلسطینی حکومت ایک ہوشیار یہودی ہیرو د نامی کے قبضے میں آئی۔ ۴۱ء میں رومیوں نے اسی کے ایک پوتے ہیرو داگرپا کو اس سلطنت کا فرماں روا بنا دیا۔ جس نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر مظالم کی انتہا کر دی۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہودیوں اور رومیوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ چنانچہ یہودیوں نے رومیوں کے خلاف کھلی بغاوت کر دی۔ ۷۰ء میں ٹیٹوس رومی نے بزورِ شمشیر یروشلم کو فتح کیا۔ اس موقعہ پر قتلِ عام میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودی مارے گئے۔ ۶۷ ہزار گرفتار کر کے غلام بنائے گئے۔ ہزارہا یہودی پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ اور ہزاروں کو مختلف شہروں

میں بھیجا گیا تاکہ وہاں ایمفی تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختہ مشق بننے کے لئے استعمال کیا جائے۔ تمام دراز قامت اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لئے چن لی گئیں۔ اور یروشلم اور ہیکل کو مسمار کر کے پیوندِ خاک کر دیا گیا۔ (تفہیم القرآن جلد ۲)

بار بار کی ان تباہیوں اور بربادیوں سے بچ کر ان کی ایک کثیر تعداد مغربی ممالک میں پھیلی۔ اور ایک بہت طویل زمانے تک اپنے مرزبوم فلسطین کی بازیابی کے لئے تڑپتی رہی۔ کم و بیش دو ہزار سال تک یہودیوں کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اور وہ غربت اور مسافرت کی مضطربانہ زندگی گذارنے پر مجبور رہے۔

یورپ کے دورانِ قیام میں بھی ان کو عزت و سکون کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ ایک زمانے تک تو بے خانماں اور مقامی آبادیوں کی چاکری کی ذلت برداشت کرتے رہے۔ اور جب دنیا پرستانہ مہارت اور ہر جائز و ناجائز طریقہ سے مٹھی بھرنے کی استحصالی روش سے معیشت کا خون چوس کر ان کا ایک طبقہ[1] وہاں کی اقتصادی زندگی پر چھا گیا تو بھی اپنے قومی رزائل کی بنا پر وہاں کی معاشرت میں کوئی جگہ نہ پا سکے۔

طرد و ضرب کی ان بے شمار رسوائیوں کے باوجود ان کے موروثی خصائل کی کارفرمائیوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ مال و دولت اور متاعِ دنیا سے والہانہ دل بستگی اور خدا تعالیٰ کی محبوب اور چہیتی قوم ہونے کا غرّہ بدستور قائم رہا۔ تمول اور تونگری اور نسلی برتری کے پندار نے ان کے اندر بے جا بڑائی اور ڈھٹائی کی قباحتیں ابھاریں جن کی وجہ سے پورا عیسائی معاشرہ ان سے متنفر ہوا۔ اور جلد ہی وہ عوام و خواص کی نگاہوں میں مبغوض ٹھہرے۔

عام تاثر سے متاثر ہو کر یورپ کی دو بڑی قوتیں حکومت اور کلیسا ان کے خلاف حرکت میں آئیں۔ چنانچہ دونوں کی ملی بھگت سے ۱۵۵۵ء میں پوپ پال چہارم نے ان کو معاشرتی زندگی سے پوری طرح منقطع کرنے

---

[1] اس طبقہ کی معاشی اجارہ داری اور تونگری کا یہ حال تھا کہ ایک وقت آیا کہ یورپ کی اقتصادی زندگی کی شہ رگ ان کے ہاتھ میں تھی۔ تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔ بڑے بڑے بنک اور ساہوکارے انہوں نے کھول رکھے تھے نہ صرف عیسائی کسان اور جاگیردار ان کے سودی کاروبار کے پھیلے ہوئے جال میں گرفتار تھے بلکہ جنگوں اور ہنگامی ضرورتوں کے وقت حکومتیں بھی ان سے قرض لینے پر مجبور تھیں۔ اس کے باوجود یہودیوں کی اکثریت معاشی زبوں حالی کی شکار تھی۔ اور یورپ کے صنعتی نظام میں محنت مزدوری کر کے زندگی بسر کرتی تھی۔

اور عیسائی سماج کو ان کی سازشوں سے محفوظ رکھنے کے لئے غیتو یعنی یہودی باڑے قائم کرنے کے احکام صادر کئے۔ ان کے تحت کوئی غیر یہودی کسی یہودی کی ملازمت یا ماتحتی میں کام نہیں کر سکتا تھا۔ حکم جاری ہوا کہ یہودی ہر وقت امتیازی بیج لگا کر رہیں۔ ان کی مذہبی کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ انہیں تمام اہم مناصب اور پیشوں سے محروم کر دیا گیا۔ اور ان پر اعلیٰ تعلیمی اداروں کے دروازے بند کر دئے گئے [1]

غیتو کی الگ تھلگ زندگی میں یہودیوں کی سازشی ذہنیت کو اور جلا ملی۔ غیتو کی زندگی میں انہوں نے اپنی اجتماعی زندگی کو تلمود کے پیش کردہ خطوط پر استوار کرنے کی جدوجہد کی۔ اسی زندگی سے آگے چل کر کمیون (COMMUNE) سسٹم کا تصور وضع کیا گیا۔ انہی خطوط پر یہودیوں نے فلسطین پر آباد ہوتے وقت کبتز [2] (KIBBUTZ) یعنی مشترکہ جائداد اور اجتماعی ملکیت کے تصور پر نئی بستیاں بسائیں۔ غیتو نے آہستہ آہستہ ریاست در ریاست کی صورت اختیار کر لی۔ ہر غیتو کا انتظام ایک مقامی کونسل کرتی تھی۔ مقامی ربی جس کا چیئرمین ہوتا اسے سب سے زیادہ اختیارات حاصل ہوتے وہ کونسل کے فیصلوں پر نظر ثانی کر سکتا تھا ان کی اپنی عدالتیں تھیں جن میں دیوانی مقدمات کے فیصلے ہوتے۔ صرف فوجداری مقدمات میں انہیں ریاست کی عدالتوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا۔ غیر یہودی حکام سے رابطہ رکھنے کے لئے ایک افسر نامزد کیا جاتا۔ پرائمری تعلیم ہر یہودی بچے کے لئے لازمی تھی۔ یہ تعلیم مذہبی ہوتی تاہم یہودی سیکولر تعلیم بھی حاصل کرتے جس کا انتظام ہر صاحبِ حیثیت یہودی خاندان خود کرتا تھا [3]

سترھویں صدی عیسوی میں یہودیوں کو اسپین سے نکالا گیا تو ان کے بے شمار خاندان مغربی اور شمالی

---

[1] روس میں مسلمان قومیں

[2] ان بستیوں میں ملکیت مشترک ہوتی تھی (سوشلزم میں بھی یہودی اہلِ فکر کو مشترک قرار دیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کبتز میں ملکیت بستی میں آباد یہودی خاندانوں کی ہے۔ اور سوشلسٹ حکومت میں اسے حکومت کو ہاتھ دے دیا گیا ہے) ان بستیوں میں سب خاندان مشترک طور پر رہتے ہیں۔ ازدواجی زندگی بس زن و شوہر کے تعلقات تک محدود رہتی ہے۔ بچوں کے ساتھ ماں باپ کا تعلق برائے نام ہے۔ بچے اجتماعی نرسریوں میں پلتے اور ہوسٹلوں میں رہتے ہیں ماں باپ انہیں وہاں جا کر ملتے ہیں۔ ایک عورت کے کئی شوہر اور ایک مرد کی کئی کئی بے نکاحی بیویاں ہوتی ہیں۔ نکاح و طلاق کو "بورژوائی" روایت قرار دیا گیا ہے۔ آزاد محبت اور آزاد ہوس رانی پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ مرد اور عورت کبتز کے وسیع ہال میں کھانا کھاتے ہیں۔ زن و شوہر کے تعلقات کے لئے حمام بنائے گئے ہیں۔ زرعی اور صنعتی پیداوار کی آمدنی کا مالک کبتز ہوتا ہے جس کی انتظامیہ کبتز کے ارکان ووٹوں سے منتخب کرتے ہیں۔

[3] روس میں مسلمان قومیں

یورپ میں آباد ہو گئے۔ ان لوگوں کو مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں اسپین میں اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں اثر و نفوذ حاصل تھا۔ اسپین میں مسلمانوں نے جو یونیورسٹیاں قائم کیں۔ انہی کے فارغ التحصیل یورپی نوجوان یورپ میں علمی و فکری بیداری کی تحریک کا آغاز بنے۔ ان یونیورسٹیوں سے یہودیوں نے پورا پورا استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ ایک صدی تک عیسائی حکومت کے جبر و تشدد کا شکار ہونے کے باوجود جب اسپین سے نکل کر یورپ کے مختلف ملکوں میں آباد ہوتے تو علم و ہنر میں یورپی عیسائیوں سے کہیں آگے تھے یہاں انہوں نے جدید یورپ کے افکار و نظریات کی تشکیل و فروغ میں بھرپور حصّہ لیا۔

غیتو کی زندگی کے دوران یہودیوں میں کئی تحریکیں اٹھیں۔ متعدد افراد نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا ان تحریکوں اور مدعیانِ مسیحیت نے یہودیوں میں عیسائی اقتدار سے آزادی اور غیر یہودی دنیا پر چھا جانے کا جذبہ پیدا کیا۔ یورپ میں عقلیت پرستی اور آزاد خیالی کی لہر کے پیچھے غیتو کی چار دیواری میں پرورش پلنے والا یہی جذبہ اور تصور کار فرما تھا۔ عیسائی بادشاہ یہودیوں کے خلاف نفرت و عناد کی فضا پیدا کرنے میں برابر کے حصہ دار تھے۔ ان کی قوت توڑنے کے لئے مطلق العنانی، استبداد اور جاگیردارانہ نظام جس پر پوری ریاست کا سیاسی ڈھانچہ قائم تھا، کے خلاف آواز بلند کی۔ اور شہری آزادیاں، شہری حقوق دینے اور اقتدار میں عوام کو حصہ دار بنانے کی تحریک شروع کی۔ یورپی یہودیوں کی اکثریت جو معاشی لحاظ سے وہاں کے تیسرے درجے کے لوگوں پر مشتمل تھی، اور جو صنعتی مراکز اور بڑے بڑے کارخانوں میں محنت و مزدوری کے پیشے سے متعلق تھی اس عام فکری بے چینی سے فائدہ اٹھا کر صنعتی دنیا میں اپنی بالادستی قائم کرنے کی جدوجہد کرنے لگی اور پرولتاریوں (محنت کشوں) کی اہمیت جتا جتا کر ان کی باقاعدہ انجمنیں اور تنظیمیں تشکیل دیں اور اس کے کلیدی عہدے خود ہی سنبھال لئے [1] پرولتاری قوت و شوکت کا مطلب یہودی قوت و شوکت ہی تھا۔ اس لئے یہودی مفکرین نے پرولتاری تحریک کو مضبوط اور قوی بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اجتماعی ملکیت کی برکات بڑھا چڑھا کر سوشلزم کی خیالی جنت دکھا دکھا کر اکثر عیسائیوں کو بھی مزدور راج قائم کرنے کے لئے ذہنی اور عملی طور پر آمادہ کیا۔ اس طرح سے یورپ کی معیشت اور سیاست پر یہودیت ایک قوتِ محرکہ کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ اثر ڈالتی گئی۔ اور اس کو اس کے پرانے نظام سے سوشلزم کے نئے نظام کی طرف کھینچتی گئی۔

---

[1] سوشلزم کا یہودیت کے ساتھ بنیادی روابط اور اساسی رشتوں پر "روس میں مسلمان قومیں" نامی کتاب کے حسب ذیل اقتباس سے روشنی پڑتی ہے۔ سوشلزم جس کا ابتدا پرولتاری انجمنوں سے آغاز ہوتا ہے، ابتدا سے لے کر ترقی کے آخری منازل تک ایک یہودی تحریک رہا۔ کارل مارکس جس نے اس کو علمی بنیادوں پر استوار کیا (TIER) کے ایک یہودی حاخام (مذہبی پیشوا) کا پوتا تھا مارکس چھ برس کا تھا کہ اس کے باپ نے (جو خود بھی حاخام تھا) عیسائیت قبول کر لی۔ اس کی ماں آخر دم تک یہودی رہی۔

کارل مارکس کا دست راست فرڈی ننڈ لازیل جس نے پہلی انٹرنیشنل میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا نسلاً ہی نہیں مذہباً یہودی تھا۔ سوشلزم عملاً بھی یہودی تحریک ہے۔ روس، یورپ اور امریکہ میں ہر جگہ سوشلزم کے صف اول کے رہنما یہودی تھے۔ روس میں سوشل انقلابیوں کا رہنما ایگزنڈر کرنسکی جو زارشاہی کا تختہ الٹنے کے بعد جمہوری حکومت میں وزیراعظم بنا پیدائشی اعتبار سے یہودی تھا۔ شیشلسٹ ڈیموکریٹک پارٹی جو آگے چل کر کمیونسٹ پارٹی کہلائی۔ اس کا بانی پلیخانوف بھی یہودی تھا۔ موجودہ سوشلسٹ روس کا بانی لینن ایک یہودی النسل جرمن ڈاکٹر ایگزینڈر بلانخ کا نواسہ تھا۔ مارتوف مدت دراز تک لینن کے ساتھ کام کرتا رہا اور جب اس کی سازشوں سے سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں پھوٹ پڑی تو منشویک (اقلیتی گروپ) کا سربراہ بنا۔ یہ شخص بھی یہودی تھا۔ ٹراٹسکی جس نے سرخ فوج منظم کی اور کرنسکی کی جمہوری حکومت کا تختہ الٹا۔ اور جس کو لینن کی زندگی میں اس کا جانشین سمجھا جاتا تھا یہودی تھا۔ روس کی سوشلسٹ یونین کا پہلا چیئرمین جیکب صورو ولف بھی یہودی تھا۔ لینن کے قریب ترین ساتھی زنوویف، کامینف اور کارل راڈک بھی یہودی تھے۔

سوشلسٹ تحریک کا سرمایہ بھی یہودیوں نے فراہم کیا ان میں امریکہ کے یہودی ساہوکار جیکب شف اور کوہن لوبیب، جرمنی کی کمپنی آٹو کوہن ویسٹ بالین رائن لینڈ سنڈیکیٹ، شاکہوم کا بنک داربورگ، سینٹ پیٹرزبرگ کا بنک گنزبورگ بہت نمایاں ہیں۔ جیکب شف کے بارے میں امریکی خفیہ پولیس نے رپورٹ دی کہ اس نے بالشویک انقلاب کو ۲۰ لاکھ ڈالر بطور امداد دیے۔ اسی طرح بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک کے رہنما بھی یہودی تھے۔ پولینڈ کی سوشلسٹ ڈیموکریٹک پارٹی کا پہلا نام جیوئش ڈیموکریٹک پارٹی تھا یہی صورت لیتھونیا کی سوشلسٹ ڈیموکریٹک پارٹی کی تھی۔ جرمنی کا سوشل لیڈر ایڈورڈ برنسٹین۔ اسٹریا کا ایڈمر۔ اور امریکی لیبر فیڈریشن کا بانی سیموئیل گومپرز بھی یہودی تھے۔ ارجنٹائن میں کمیونسٹ پارٹی کے بانی سالومن بیرزامین اور جولیا فنز تھے یہ دونوں میاں بیوی یہودی تھے برازیل میں ۱۹۳۵ء میں انقلاب برپا کر کے ملک پر قبضہ کر لیا گیا اس کے لیڈر ایک شخص کے سوا سب یہودی تھے فرانس میں مارکزم کے علمبردار ہمیشہ یہودی رہے ہیں۔ بلجیم میں کمیونسٹ پارٹی کا بانی چارلس ہلڈسر یہودی تھا۔ سویڈن کی کمیونسٹ پارٹی کا سب سے بڑا معاون آئیور کروگر یہودی تھا۔ ۱۹۲۰ء میں باکو کے مقام پر ۱۹ر جولائی سے ۷ اگست تک بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹیوں کی نمائندہ انجمن کمنٹرن (Commeatern) کا اجلاس کارل راڈ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں ہنگری سے بیلا کوہن، فرانس سے روزمر۔ امریکہ سے ریڈ۔ جرمنی سے سٹالن ہارڈ۔ ہالینڈ سے جانسن اور بلقان سے شنابلن شریک ہوئے یہ سب یہودی تھے۔ یورپ اور امریکہ کی سوشلسٹ تحریک میں یہودیوں کا کتنا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ اس کے متعلق مفصل معلومات کے لئے (Lovis Mar:HanKo) کی کتاب (The World Conqverors) کا مطالعہ نہایت مفید رہے گا۔

ایک نظر عرب ممالک پر بھی ڈالتے چلیں۔ کمنٹرن نے ان ملکوں میں جن لوگوں کو سوشلسٹ تحریک منظم کرنے کے لئے بھیجا وہ سب کے سب یہودی تھے۔ کلامن بیہیل کو سوری اور ناموم لیشتیشکی کو مصر۔ افریوخ کو فلسطین اور یاکوف تیبر کو شام بھیجا۔ ان لوگوں کی جدوجہد سے سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں فلسطین کمیونسٹ پارٹی قائم ہوئی اس کے بانی اور ارکان سب یہودی تھے یہی پارٹی ۱۹۴۲ء تک عالم عرب میں سوشلسٹ تحریک کی رہنمائی کرتی رہی۔

مصر میں سوشلسٹ پارٹی ۱۹۲۱ء میں وجود میں آئی۔ اس کا بانی اسکندریہ کا لکھ پتی یہودی جوہری روز تھا۔ شام اور لبنان میں کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ ہوئی اس میں فلسطینی کمیونسٹ پارٹی کے یہودی مندوب برگر کا ہاتھ تھا۔ آگے چل کر ابوزیام، ایلیا ہو میٹر اور نحشنکی نے سوشلسٹ نظریات پھیلانے اور سوشلزم کی جڑیں مضبوط کرنے میں سرگرم حصہ لیا۔ یہ سب یہودی تھے اور اپنا چہرہ چھپانے کے لئے انہوں نے فرضی نام رکھ لئے تھے۔

عراق میں کمیونسٹ پارٹی اور بائیں بازو کے عناصر تمام عرب ملکوں سے زیادہ طاقتور تھے۔ اور یہ یہودیوں ہی کی جدوجہد کا نتیجہ تھا کمیونسٹ پارٹی اور اس کی ذیلی تنظیموں پر یہی لوگ چھائے ہوئے تھے عراق کی مرکزی کمیٹی کا اہم ترین رکن صدیق یہودی تھا۔ بغداد کی مزدور یونین کا لیڈر یوسف زلوذ تھا۔ بعد میں اسے بائیں بازو کی قوتوں اور مزدوروں کو منظم کرنے کے لئے بصرہ بھیج دیا گیا۔ اسی طرح پیشہ ور تنظیموں کی زمام بھی یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ مثلاً جفت سازوں کی یونین کا لیڈر سلیم منشی۔ درزیوں کا موشے کوہین۔ رنگ سازوں کا یوسف زلوف اور تاجروں کا حسقیل ابراہیم سب یہودی تھے۔

Joan Pennar, نیز دیکھئے البلاغ کویت ۱۷ر اگست ۱۹۶۹ء ص ۱۵

U.S.S.R. And the Arabs (London 1973) P. 35

باب دوئم

سوشلزم کا فکری سفر

معیشت سے الحاد تک

سوشلزم نظریاتی ارتقاء کے کئی ادوار سے گزرا، اور مختلف فکری تغیرات سے اپنا سرمایۂ وجود اکٹھا کرتا رہا۔ پچھلی بحث کے مندرجات سے یہ حقیقت طشت ازبام ہوگئی ہے کہ اس کا آغاز ایک فاسد اور بگڑی ہوئی معیشت کی اصلاح کی فکر سے ہوا جو بہت جلد ہی انسان کی نفسیاتی کمزوریوں سے متاثر ہو کر اپنی اصلیت اور افادی حیثیت کھو بیٹھا، اور اقتصادی ابتری کو ختم کرنے کی مخلصانہ کوشش کی بجائے انتقامی جذبات سے مغلوب ایک باغیانہ سازش میں تبدیل ہوگیا۔

اپنی سیدھی سادھی ابتدار سے موجودہ پیچیدہ انتہا تک کا راستہ اس نے کیوں اور کس طرح طے کیا؟ اس پر کئی پہلوؤں سے بحث کی گنجائش ہے مگر ہم باقی تمام پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے فقط یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ کن حالات و مقتضیات کے تحت اس کو وہ کھلا ہوا الحاد اختیار کرنا پڑا جو موجودہ سوشلزم کے تمام اجزائے ترکیبی پر غالب ہے بلکہ سچ پوچھئے تو موجودہ سوشلزم الحاد ہی کا ایک مہذّب اور شائستہ سا عنوان ہے جس کے دامن میں خدا اور رسولؐ اور ہر قسم کی مذہبیات اور اخلاقیات کے قطعی انکار کے سوا اور کچھ رہا ہی نہیں۔

اس باب میں انہی مقتضیات کی تشریح و تفصیل ہے جو سوشلزم کو الحاد تک پہنچانے میں بنیادی اور عمومی کردار کے حامل ہیں:



اہلِ کلیسا کی تنگ نظری

یورپ میں سائنسی ترقی کا زور تھا۔ نئی نئی ایجادات نے ملک کے طول و عرض میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ زندگی کا ہر شعبہ پرانی چال چھوڑ کر نئے نئے انداز اپنا رہا تھا۔ تہذیب و تمدن کی وضعیں بدل رہی تھیں۔ اور پرانی معاشرت کا ایک ایک طور قدامت کے ننگ و عار سے کھسک کھسک کر اپنا خول چھوڑ رہا تھا۔ اور ان کی جگہ جدید اطوار کی آبادکاری بڑی تیزی سے ہو رہی تھی۔

یورپ کی دوسری بڑی قوت کلیسا جو مذہبیات کی نگران و پاسبان تھی حقیقت شناسی، نکتہ رسی، بالغ نظری اور وسیع ظرفی کے اوصاف سے محروم ہو چکی تھی۔ انسانی سیرت و کردار کی جانچ پرکھ اور اس کے بود و باش کے طریقوں کی صحت و فساد معلوم کرنے کے لئے وہ ان تنگ و تاریک اور گھسے پٹے پیمانوں کو استعمال کرتی جو خدا تعالیٰ کی کسی شریعت نے نہیں بلکہ اس کی اپنی تنگ نظری اور خانہ ساز تزبذب و ترہیب نے متعین کئے تھے۔ انہی پیمانوں کے نپے تلے انداز بھلے اور اس کے ماسوا سب کچھ اس کی نگاہ میں برائیوں کی فہرست میں شامل تھا۔ اہلِ کلیسا زندگی کے قدیم طور طریقوں کو مذہب کا اٹوٹ انگ اور ان سے سر مو ہٹنا مذہبی زندگی سے انحراف کے مترادف سمجھتے تھے۔

سائنسی ترقی اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی معاشرتی تبدیلیاں کلیسا کی رجعت پسندی کو بڑی شاق اور ناگوار گذر رہی تھی۔ چنانچہ اس نے جدیدیت کے اس پورے نظام کو بیک جنبش قلم ناجائز اور اس کے پرستاروں کو گردن زدنی قرار دیا۔

یورپ کا دانشور طبقہ کلیسا کی جابرانہ روش اور نامعقول مذہبی پابندیوں سے پہلے ہی سے نالاں اور بدگماں تھا۔ نئی زندگی کی بابت اس کی یہ سطحیت و جمود اور پھر اس درجہ کی سخت گیری دیکھ کر اور بھی زیادہ پریشان ہوا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ طبعی حقائق کی دریافت سے زندگی کا ایک نیا خاکہ مرتب ہو رہا ہے جس میں انسانیت زیادہ سے زیادہ آرام و راحت اور عمدگی کے ساتھ اپنے منصبی فرائض سرانجام دے سکتا ہے تو مذہب کا یہ نام نہاد محافظ کیوں اس پر ناک بھوں چڑھا رہا ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال نے دانشوروں کے

اندر باغیانہ خیالات کی طرح ڈالی اور وہ کلیسا کے مقابلے پر کمربستہ ہوئے۔

یورپ کے یہودی جو کلیسا کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو کر خار کھائے بیٹھے تھے موقع پاتے ہی میدانِ مبارزہ میں کود پڑے اور کلیسائی مذہب سے برسرِ پیکار دانشوروں کی پیٹھ ٹھونکنے لگے۔[۵]

دانشوروں کی یہ لڑائی باہم مذہبی مسلّمات کے خلاف نہیں بلکہ اُن بناوٹی تقدسات کے خلاف تھی جو اس وقت کے مذہبی اجارہ داروں نے اپنی دکان چمکانے کے لئے قائم کی تھیں[۶] لیکن بالآخر باہمی ضد اضدی سے اس بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح پھیلنے لگی جس کے بے رحم شعلے خشک و تر کی تمیز کئے بغیر ہر چیز کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ چنانچہ نہ صرف وہ اضافی لواحقات بے وقعت ہو کر رہ گئیں جو دراصل عیسائی پادریوں کی من مانی تشریح کا نتیجہ تھیں بلکہ مذہبی اساسات بھی اس کی زد سے نہ بچ سکیں اور خدا اور رسول اور آخرت تک کے تصورات کو

۵۔ یورپ صدیوں تک فکری و تہذیبی پستیوں میں غرق رہنے کے بعد ابھر رہا تھا۔ نئی نئی علمی و فکری راہیں کھل رہی تھیں سائنس کے میدان میں تحقیقات زور شور سے جاری تھیں۔ نئے نئے انکشافات ہو رہے تھے۔ بھاپ کی قوت کے انکشاف سے صنعت کی دنیا میں انقلاب آگیا تھا۔ ہر طرف کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہو رہی تھیں۔ تنگ نظر کلیسا نے جس کے پاس معدودے اخلاقی تعلیمات کے سوا اجتماعی زندگی کا کوئی لائحہ عمل نہ تھا۔ اس علمی و فکری انقلاب کو خلافِ مذہب قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں کے تعلیم یافتہ طبقے اور پادریوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ عیسائی حکومتوں نے پادریوں کا ساتھ دیا اور فکرِ جدید کے علمبرداروں پر ظلم توڑے اس کا ردِعمل جدید مفکرین اور دانشور طبقے میں مذہب و حکومت کے خلاف نفرت و فکری و سیاسی آزادی کی تڑپ کی صورت میں ہوا۔ یہودی نظریات نے اس نفرت کو مزید ہوا دی شہری حقوق اور سیاسی آزادیوں کے پردے میں یہودی مفکرین نے عیسائی دانشوروں کو اپنے حق میں استعمال کیا۔ ان مفکرین میں مڈسے میڈلسون (۱۷۲۹ء - ۱۷۸۶ء) نمایاں مقام رکھتا ہے یہ خود بڑا راسخ العقیدہ یہودی تھا۔ مگر عیسائی معاشرے میں فکری و سیاسی نفوذ پانے کے لئے یہودیوں کو جدید طرزِ زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتا تھا اس نے عیسائی اہلِ فکر کو سب سے زیادہ متاثر کیا (روس میں مسلمان قومیں از آباد شاہ پوری)

۶۔ کلیسائی اقتدار کے خلاف باقاعدہ تحریک شروع کرنے والا سب سے پہلا شخص مارٹن لوتھر تھا جو ۱۴۸۳ء میں ایسل بن (Eisal) کے مقام پر پیدا ہوا۔ آرفرٹ (Eur Furt) یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور وٹین برگ (Witn Burgh) کی یونیورسٹی میں لیکچرار مقرر ہوا (مختصر تاریخ انگلستان از ایم اے زیدی ایم اے)

دقیانوسی اور اوہام سمجھا جانے لگا۔

کلیسا اور دانشوروں کی اس جنگ سے یورپ کے عوام بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ پورے معاشرے میں اباحیت اور آزاد خیالی کا رجحان پیدا ہونے لگا جو رفتہ رفتہ مذہب بیزاری کی ایک منظم اور ملک گیر تحریک کی شکل میں نمودار ہوا۔

قریب قریب یہی زمانہ تھا یورپ میں اشتراکی خیالات کے پنپنے اور پروان چڑھنے کا بھی۔ علاوہ ازیں دونوں ...... اباحیت اور اشتراکیت ...... ایک ہی بطن ...... یہودیت ...... سے تولد ہوئے تھے اور اسی کے دودھ سے پرورش پا رہے تھے۔ لہٰذا ایک کا دوسرے سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہو جانا بالکل قدرتی بات تھی۔

علومِ طبیعیہ کی ترقی کا منفی اثر

انسان کی کامیابی اور ناکامی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اس نے دنیا و آخرت کی زندگیوں میں سکون و اطمینان کا کتنا حصہ پا لیا ہے۔ جس قدر اس کو چین و قرار نصیب ہو گا اتنا ہی وہ کامیاب و کامران قرار پائے گا اور جتنا وہ بے چین و بے قرار ہو گا اسی کے بمقدار ناکام و نامراد محسوب ہو گا۔

سکون و اطمینان کیفیات کے قبیلے میں سے ایک کیفیت کا نام ہے۔ جس کو ہر شخص محسوس تو بڑی آسانی سے کر سکتا ہے اور کبھی اپنے مطمئن یا بے اطمینان ہونے میں کسی قسم کے تردّد کا شکار نہیں ہوتا لیکن اس حقیقت کی تفصیل کو الفاظ کا ایسا جامہ پہنانے میں بڑی مشکل سے دوچار ہوتا ہے جو اس کی قد و قامت پر بلاکم و کاست راست آجائے۔ ہم اپنی دانست کی حد تک سکونِ دل کی اس کیفیت کو کہتے ہیں جس کے پیدا ہونے سے انسان کو ایک ایسی سیر چشمی حاصل ہو جاتی ہے جس میں دوزخِ نفس کے "ہَل مِن مَزید" کا ہر وہ چیختا ہوا تقاضا خود بخود دب کر فنا ہو جاتا ہے جو اس کو زندگی بھر مضطرب کئے رکھتا ہے۔

یہ فرق کئے بغیر کہ انسان کے اندر سے تقاضے ابھرنے کی جگہ نفس ہے یا روح اور پھر محل کے اعتبار سے ان میں کیا کیا امتیازات ہوتے ہیں۔ ہم حالاتِ تقاضا کی بنیاد پر اس کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ جب کہ اثنائے تقاضا ہی میں صاحبِ تقاضا کو اپنی محرومی کا اس شدت سے احساس ہوتا ہے کہ جس کی ٹیسیں اس کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپاتی ہیں اور دوسری قسم وہ جب کہ دورانِ تقاضا میں بدن کے ریشے ریشے اور روح

کے مسامے مسامے میں ایک ناقابلِ بیان ٹھنڈک اور سرور پاتا ہے۔ پہلی قسم کا تقاضا سکون کو برباد کرنے والا اور دوسری قسم کا تقاضا اس کو فزوں تر کرنے والا ہوتا ہے۔

دنیا اور اس کی زندگی امتحان کا ساز و سامان ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ انسان اپنی مادی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے مادی چیزوں سے استفادہ کرنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ دنیا میں اسی کی بنیاد پر اس کی روحانی زندگی کی بالائی عمارت کھڑی ہے تاہم اس کے روحانی سکون و اطمینان کا اس کی مادی زندگی سے چنداں تعلق نہیں۔

مادی اشیاء سے مادی زندگی کی بقا کی حد تک استفادے کی جس قدر ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی فطرت اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے اس کے رنگ ڈھنگ بتائے اور سکھلائے لیکن اس سے بڑھ کر مادی اشیاء کے استعمال کے ان جزئیات کی تعلیم سے فطرت یا خدا کی شریعتیں خاموش اور ساکت رہیں۔ جن کو اس کی مادی زندگی کے ارتقاء کے سلسلے میں بروئے کار لایا جا سکتا تھا۔ اس کام کو رب تعالیٰ نے اس کی عقل پر چھوڑ دیا تاکہ ایک طرف تو نفس کے زوردار تقاضے اس کو عقل کے استعمال کا خوگر بنائیں اور دوسری طرف اشیائے مادی کی پیچیدگیوں اور ان کی حکمت آمیز ہیئت و ترکیب کا مطالعہ اس کو خالق کی قدرت و حکمت کی طرف متوجہ رکھے اور وہ ایمان و اتقان کا ملکہ اور رسوخ حاصل کرتا چلا جائے۔

اس کے برخلاف انسان کا روحانی چین و سکون جو اس کی دنیا و آخرت کی زندگیوں کی کامیابی کا اصل الاصول ہے۔ چونکہ ایسے افکار و اعمال سے مربوط اور وابستہ تھا جن کا ادراک اس کی عقل کی دسترس سے باہر تھا۔ اس لئے شفیق و مہربان خدا نے فکر و عمل کا وہ پورا نظام اس کو عطا فرمایا جو اس کی روحانی بقا اور نشو و ارتقاء دونوں کے لئے کافی شافی ہے۔

کتنے انسان ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ انسان کی مادی زندگی کا نظام اس کی روحانی زندگی کے نظام سے بالکل الگ اور جدا ہے اور ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا عقلمندی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کی بے عقلی اور حماقت ہے۔ اسی حقیقت سے بے خبری یا چشم پوشی نے یورپ کے ایک بڑے حصے کو اس فکری انتشار میں مبتلا کر دیا۔ جس سے ان کی زندگی کا سکون تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں طبعی علوم بہت تیزی سے ترقی کر رہے تھے ۱۷۶۳ء میں دخانی انجن سے بڑی بڑی مشینیں چلانے کا کام لیا جانے لگا۔ ۱۸۰۴ء میں ٹریوتھک (TREVITHICK) نے واٹ کے

تجویز کردہ انجن میں مزید اصلاح کی جس سے وہ حمل ونقل کی ضروریات کے لئے قابلِ استعمال ہوگیا چنانچہ ۱۸۲۵ء میں ڈارلنگٹن اور سٹاکٹن کے درمیان پہلی ریلوے کا افتتاح عمل میں آیا۔ ذرائع نقل وحمل اور قطعِ مسافت کے دائرے میں ان ایجادات کی وجہ سے جو عظیم الشان تبدیلی عمل میں آئی اس کا اندازہ کچھ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ نپولین نے روس میں شکست کھانے کے بعد ولنا سے پیرس تک کی ۱۴۰۰ میل کی مسافت ۳۱۲ گھنٹوں میں طے کی تھی جس کا فی گھنٹہ اوسط پانچ میل ہوتا ہے۔ لیکن ریلوں کی ایجاد کے باعث یہی سفر ۲۸ گھنٹوں میں طے کیا جانے لگا۔ گویا کہ جملہ مسافتیں ایک عشر تک کم ہوگئیں۔ دخانی انجن کے بعد دخانی جہازوں کی ایجاد عمل میں آئی تو نہ صرف بحری سفر کے خطرات گھٹ گئے بلکہ آمد و رفت کے اوقات کا تعین بھی ہونے لگا۔ والٹا گالوانی اور فیراڈے کے نتائج تحقیقات نے برقی قوت کے استعمال کا دروازہ کھول دیا۔ تار برقی پہلی مرتبہ ۱۸۳۵ء میں ایجاد ہوئی۔ ۱۸۵۱ء میں انگلستان اور فرانس کے درمیان تار برقی کا پہلا تحت البحر سلسلہ قائم کیا گیا۔ تھوڑے عرصے میں اس کا جال ساری دنیا کے سمندروں میں پھیل گیا اور ایک ملک کی خبریں مہینوں اور سالوں کی بجائے دنوں اور گھنٹوں میں دوسرے ملکوں تک پہنچنے لگیں۔

اٹھارھویں صدی کے وسط تک کچے لوہے کو صاف کرنے کی غرض سے لکڑی کا کوئلہ استعمال کیا جاتا تھا اور اس طرح جو صاف لوہا نکلتا تھا اس کے صرف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ڈھالا جاسکتا تھا۔ لوہے کی بڑی سے بڑی مقدار جسے ایک وقت میں ڈھالنے کی کوشش کی جاسکتی تھی دو یا تین ٹن سے زیادہ نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے بعد کچے لوہے کو صاف کرنے کے لئے پتھر کے کوئلے کا استعمال کیا جانے لگا۔ اس شعبے میں مزید ترقی اس وقت عمل میں آئی جب نئی قسم کی بھٹیاں تیار کی جانے لگیں۔ اور بالآخر برقی بھٹی کی ایجاد نے لوہے اور فولاد کی صنعت کو بامِ عروج پر پہنچا دیا چنانچہ ان بھٹیوں میں ہزاروں من لوہا ایک وقت میں ڈال کر گلایا جاتا تھا اور لوہے کی بڑی بڑی وسیع چادریں تیار کی جاتی تھیں۔ جس کے نتیجے میں دیوہیکل انجن لوہے کے بڑے بڑے جہاز اور وسیع وعریض پل بننا شروع ہوگئے۔ انیسویں صدی سے قبل دو ہزار ٹن سے زیادہ کسی جہاز کا وزن نہیں ہوتا تھا۔ اب پچاس ہزار ٹن وزن کے جہاز معمولی سمجھے جاتے ہیں[۵]

ہماری مادی زندگی کی ان حیرت انگیز اکتشافات اور طبعی تحقیقات کے نتیجے میں بدقسمت یورپ نے کیا کچھ پایا اور کیا کچھ کھویا؟ اس استفہام کا مختصر جواب یہ ہے کہ بے شک چند حقیر اور بے وقعت قسم کی مادی تعیشات تو اس کے ہاتھ لگیں مگر دین و مذہب کی اس دولت اور نعمتِ عظمیٰ سے ہاتھ دھو بیٹھا جو اس کے

[۵] اشتراکیت اور نظامِ اسلام

امن وسکون کی بنیاد و اساس تھی اور جس پر اس کی ایک اچھی بھلی اخلاقی اور شریفانہ زندگی استوار تھی۔ اپنی کامیابی کے نشے میں وحشت یورپ کا از خود رفتہ انسان کچھ اس طرح سے سوچنے لگا کہ ہمارے آباؤ اجداد پرانے خیالات وافکار سے چمٹے رہنے کی بدولت زندگی کی رونق اور چہل پہل سے محروم رہے ہم نے اس فرسودگی کو بالائے طاق رکھ کر سوچ وبچار کی نئی راہیں ڈھونڈ نکالیں تو وہ رعنائیاں نصیب ہوئیں جو ان کے وہم وگمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ وہ زیب وزینت کی نئی نئی صورتوں سے لطف اندوز اور آرام وراحت کے نئے نئے طریقوں سے شاد کام ہو رہا تھا۔ اور اپنے اسلاف کی محرومیوں پر کفِ افسوس مل رہا تھا۔ اس نے یورپ کی ماضی کو تاریک خیالی اور حال کو روشن خیالی کا دور قرار دیا۔ اس کے غور وفکر کے زاویے ایسے متاثر ہوئے کہ ماضی کی ہر چیز کو ماضی کی یادگار سمجھنے لگا۔ اور اس کو گرانے کی فکر اور کوشش کرنے لگا۔

جدت پسندی کے جوش نے اس کو اس قدر خود فراموش کر دیا کہ سیاہ وسفید کی کوئی تمیز نہ کر سکا۔ اس نے پرانے خیالات واحساسات کے وہ کباڑ خانے بھی نذرِ آتش کئے جو واقعتہً جلانے کے مستحق تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ علم وآگہی کے وہ دفاتر و دواوین بھی دریا برد کر دئے جو اس کی مذہبی زندگی کا مضبوط سہارا تھے۔ عالم مادی کے میدان میں اس کی مہم جویانہ کوششوں نے جو حوصلہ افزا نتائج پیدا کئے جس کی روشنی میں اس سے متعلقہ پرانے خیالات قطعی طور پر غلط ثابت ہوتے اسی پر قیاس کر کے اس نے عالم انسانی کی عمرانی اور تمدنی زندگی کو بھی ایسی ہی کوششوں کی جولانگاہ سمجھا اور عالم طبیعی ہی کی طرح اس میں بھی علت ومعلول اور سبب ومسبب کے تعلقات کے ضوابط و قوانین اخذ کر کے عمران و تمدن کی پرانی بنیادیں ڈھا کر نئی بنیادیں متعین کرنے لگا[۱]

[۱] تشریح اس ابہام کی یہ ہے کہ عالم مادی کی بے جان اشیاء کی ہر نوع کچھ خاص خصوصیت رکھتی ہے جو اس کے تمام افراد میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ بندھے ضوابط کے تحت ان محدود خصوصیات کا ظہور با قاعدگی کے ساتھ ہوتا رہتا ہے چنانچہ مختلف طبعی خاصیات رکھنے والی مختلف چیزوں کے کیمیائی ترکیب تالیف سے ہمیشہ کے لئے ایک جیسے نتائج پیدا کئے جاسکتے ہیں اور اسی طرح یہ عمل مسلسل کئے جایا جاسکتا ہے لیکن عالم انسانی اور روحانی کا معاملہ ایسا نہیں اس میں تو بے جان اشیاء نہیں بلکہ ذی جان اور ذی ارادہ انسانوں کی ان لاتعداد اور غیر منضبط صفات وخصوصیات سے پالا پڑتا ہے جو اس کے شعور وارادے کی پیداوار ہوتے ہیں یہاں کوئی ایسی حد بندی ممکن ہی نہیں جس کو انسان کا شعور وارادہ نہ توڑ سکے یہی وجہ ہے کہ عالم مادی میں انسانی عقل نے تعمیر وترقی کے حیران کن کارنامے سرانجام دئے لیکن عالم انسانی میں اس کی فراست اپنی بے بسی اور درماندگی کا اقرار کرنے پر مجبور ہے۔

یہی وہ غلطی تھی جس کے سرزد ہونے پر اس کی روحانی زندگی کے تار و پود ایسے بکھر گئے کہ اس کو دوبارہ سمیٹنے اور یکجا کرنے میں وہ ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اسی لئے کہ وہ مادی تصورات اور روحانی افکار کے درمیان باہمی فرق نہ کر سکا۔ اور دونوں کو ایک ہی درخت کا برگ و بار سمجھ کر اکٹھا پھینک دیا۔ اشتراکیت کی ہوا بھی اسی ماحول میں چل رہی تھی۔ چنانچہ مذہب بیزاری اور علوم طبیعہ کی ترقی کے اس اثر کا تعفن و سڑاند اس کے جھونکوں میں بھی خلط ہو کر دور دور تک پہنچ گیا۔

نجی ملکیت اور مذہب کا تلازمہ

رات دن کے متعدد آنات میں ہم کتنے گناہ کرتے ہیں؟ اور نفس کی متابعت میں مذہب و اخلاق کی کتنی حد بندیاں توڑتے رہتے ہیں؟ اس کا پورا پورا اندازہ کرنے کے لئے وجدانِ صحیح اور قلبِ سلیم کی ضرورت ہے گناہ کیا ہے؟ مذاہب و ادیان کی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ اس حقیقت کے مفہوم میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے اور مختلف زمانوں میں مختلف چیزوں کو گناہوں کے زمرے میں شامل کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم اس کی ایک جامع تعریف جو بلاشبہ اپنی تمام جزئیات پر پوری طرح منطبق اور ہر لحاظ سے واضح اور غیر مشتبہ ہے اس طرح سے کی گئی ہے کہ "ہر وہ چیز جو دل کو کھٹکتی ہے گناہ ہے[1]" باقی رہا یہ مسئلہ کہ دل کو کیوں کھٹکتی ہے۔ اس کی وجہ ہر دور کے مذہبی اور اخلاقی تصورات کی وہ غیر شعوری تاثیر ہوتی ہے جس نے قلوب کے اندر بھلے برے کی تمیز اور ہر برائی کے بعد دل گرفتگی اور ذہنی کوفت کے احساس کا ایک ملکہ پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔

گناہوں کے ارتکاب سے اس لئے اجتناب کیا جاتا ہے کہ انسان اپنے ضمیر کا لعن طعن اور معاشرے و ماحول کی وہ تشنیع و تقبیح برداشت نہیں کر سکتا۔ جو ردِ عمل کے طور پر اس کا پیچھا کرتی ہے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مسلسل گناہوں کے تکرار اور عامتہ الوقوع ہو جانے سے اُن کی برائی کا احساس تک اٹھ جاتا ہے اور اب اس کے کر گزرنے پر نہ تو ضمیر کے ملامت کرنے کا کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ ہی معاشرے کی انگشت

---

[1] ایک شخص نے نبی علیہ السلام سے نیکی اور گناہ کی بابت پوچھا۔ آپ نے فرمایا نیکی اچھی خصلتیں ہیں اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکتا ہو اور لوگوں کا اس پر مطلع ہو جانا آدمی کو ناگوار ہو۔ ترمذی ابواب الزہد

...ائی کا کوئی اندیشہ۔ اب بڑے سے بڑا گناہ بھی بہت ہلکا پھلکا اور اس کا ارتکاب بہت سہل اور آسان ہو ...ا ہے۔

اسی طرح ضمیر کی ملامت کو ختم یا کم از کم خفیف تر بنا لے اور اس کی تیز و تُند دھار کو کُند کرنے کے لئے ...نفس کے شدید تقاضوں سے مغلوب ہو کر عقل انسانی حیلہ جوئیوں کا راستہ اختیار کر لیتی ہے۔ اور ایک ...نہایت ہی واضح اور بیّن گناہ محض اسی لئے جائز العمل قرار پاتا ہے کہ مفتی عقل کی نکتہ آرائیوں نے اس کی ...اباحیت کا فتوٰی داغ دیا ہوتا ہے اور اب اس کے کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا جاتا۔

عقل کی ایسی چارہ سازیاں عام طور پر انہی لوگوں کو لے ڈوبتی ہیں جن کو اپنی ہوشمندی اور دانشمندی کے ساتھ ساتھ اپنے تدین کا بھی گھمنڈ ہوتا ہے۔ گمراہی کی یہ صورت دوسری تمام صورتوں سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں گناہ کے ساتھ ساتھ جرأت و جسارت کی جارحیت بھی ہوتی ہے۔

اشتراکی مفکرین کو اشتراکی فلسفے اور اس کے مطلوبہ نتائج سے جو عشق و محبت تھی اس کے تحت اس کا عملی نفاذ ان کی تمام آرزوؤں کی واحد آرزو بن گئی تھی۔ وہ زندگی کے جملہ مظاہر میں اس کی بالادستی قائم کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی آمادۂ عمل نظر آتے تھے۔

لیکن اشتراکی جدوجہد کا آغاز کار ہی نجی ملکیت کی نفی سے ہو رہا تھا۔ اشتراکی زعماء نجی جائیداد کو طبقاتی کش مکش اور لوٹ گھسوٹ کی اصل وجہ قرار دیتے تھے۔ اور جیسا کہ کمیونزم کے لغوی معنی سے ظاہر ہے وہ نظریاتی طور پر نجی ملکیت کا خاتمہ چاہتے تھے اور اس کی بجائے تمام اراضیات اور ذرائع پیداوار کو مشترک قومی ملکیت میں دے دینا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں اس اقدام سے معاشرے میں طبقات کا بھی خاتمہ ہو جاتا اور طبقات کے خاتمے کے ساتھ ساتھ لوٹ کھسوٹ کا بھی قلع قمع ہو جاتا اور ایک خوشحال اور ترقی پذیر معاشرہ نمودار ہو جاتا۔ لینن نے ایک تقریر میں کہا۔

> "ہم اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتے ہیں۔ کمیونسٹ ایک لاطینی لفظ ہے مشترک کی لاطینی "کمیونس" ہے کمیونسٹ معاشرہ وہ معاشرہ ہوتا ہے جس میں تمام چیزیں یعنی زمین اور فیکٹریاں مشترک ملکیت ہوتی ہیں اور لوگ مشترک طور پر کام کرتے ہیں اسے کمیونزم کہتے ہیں[1]۔

---

[1] Lenin Selected Works, V. III P. 471

ایک دوسرے موقع پر لینن نے کہا۔

"زمین کا قومیانہ جس کا مطلب زمین کی نجی ملکیت کا خاتمہ ہے، حقیقت میں تمام نجی ذرائع پیداوار پر بالعموم ایک کاری ضرب لگائے گا۔ اس لئے مزدوروں کو چاہیے کہ وہ ہر ممکن طریقے پر ان اصلاحات کے نفاذ میں مدد کریں۔"[1]

ایک طرف تو انفرادی ملکیت کو ان تمام معاشی اور معاشرتی مفاسد اور مضرات کا ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا تھا جس کے ہجوم نے مزدوروں اور محنت کشوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ اور اس کے خلاف اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا جو حالات کی کسی پتلی سی تہہ کو توڑ کر باہر نکلنے کے لئے بے تاب تھا۔ اور دوسری طرف اس کو بلا استثناء ان تمام مروجہ مذاہب کی تائید و حمایت حاصل تھی۔ جس میں کسی مافوق الفطرت ہستی کا شعوری وجود اور اقتدار مسلّم تھا۔ غرض نجی ملکیت اور مذاہب کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا تعلق تھا جس کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے الگ اور جدا نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یہی وہ دور تھا جس پر پہنچ کر اشتراکی مفکرین کو اپنی خواہش ...... نجی ملکیت کا خاتمہ...... یا مذہب میں سے کسی ایک کو اختیار اور دوسرے کو مسترد کرنے کا دو ٹوک فیصلہ کرنا تھا۔ اہلِ کلیسا کی تنگ نظری اور طبعی تحقیقات کے منفی اثرات نے مذہب کی چولیں پہلے ہی سے ہلا دی تھیں۔ اس لئے اس کے انکار پر ماحول و معاشرے کے گرفت گیری اور ردعمل کا خوف بھی جاتا رہا تھا اور وسیع تر مفاد، عوام قومی اور ملی مفادات کی مصلحت بینیوں نے ضمیر کی خلش کو بھی ختم کر کے اس کی ملامت سے بے پرواہ کر دیا تھا۔ چنانچہ بڑی بے شرمی اور ڈھٹائی سے سرے سے اس کے وجود ہی کا انکار کر دیا گیا۔

اس تفصیل سے یہ بات نکھر کر سامنے آگئی ہے کہ مذہب کا انکار اشتراکیت کی وہ بنیادی ضرورت تھی جس کے بغیر وہ ایک گام کا فیصلہ طے نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس ضرورت کے تحت اس نے مذہب دشمنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

★

[1] V. I. Lenin Selected Works, V. II, P, 1'1

مارکس کا مادی نظریۂ تاریخ

ایک طویل زمانے تک یورپ کی بے چین طبیعت میں کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد اشتراکی خیالات ایک ایسی خارجی کمین گاہ کی تلاش میں تھے۔ جہاں ان کی منتشر ٹکڑیاں مجتمع ہو کر ایک غیر منقسم اکائی میں منضم ہو جائیں اور ایک سالم الاعضاء جاندار وجود کی شکل میں متشکل ہو کر ایک طرف تو زندگی کے مظاہر میں اپنی خاطر خواہ ... گری کا عمل شروع کر سکیں اور دوسری طرف اپنے ہر مد مقابل پر قریب سے شست باندھ کر مؤثر ... کر سکیں۔

کارل مارکس (۱۸۱۸ء — ۱۸۸۳ء) پہلا شخص تھا جس نے ایسی ہی ایک کمین گاہ ڈھونڈ نکالی۔ اس نے اشتراکیت کے پادر ہوا نظریات کے لئے علمی بنیادیں فراہم کیں۔ اور اس کو ایک معروضی حقیقت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

مارکس نے انسان کی پوری تاریخ کو اس کی معاشی کیفیات کا عکس قرار دے دیا۔ اس کی نظر میں قانون، اخلاق، مذہب، علوم و فنون، سیاسی ادارے اور معاشرتی آداب و رسوم یہاں تک کہ زبان اور اس کے اسالیب بیان بھی زندگی کے مادی تقاضوں اور مروجہ معاشی نظام کی ضروریات سے پیدا ہو کر نشو و نما پاتے ہیں۔ معاشی نظام ہی وہ بنیاد ہے جس پر تمدن کی بالائی عمارت کھڑی کی جاتی ہے اور یہی وہ اساس ہے جس پر انسانوں کے باہمی تعلقات قائم ہوتے ہیں خواہ یہ تعلقات خانگی زندگی سے متعلق ہوں، یا سیاسی اور معاشرتی زندگی سے۔

جی، ڈی، ایچ کول مارکس کے اس نظریے کی تشریح یوں کرتا ہے۔

"مارکس کے نزدیک ہر دور کے قانونی اور سیاسی نظامات اور وہ نظریات جو ان نظامات کی تشریح و تائید و حمایت میں قائم کئے جاتے ہیں۔ دراصل معاشی زندگی کی ضروریات سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ قوانین و ضوابط، سیاسی ادارے اور اخلاقی نظریات ان اصولوں اور معیاروں (Standards) کو مضبوط کرتے ہیں جن سے اس دور کے معاشی نظام کو قائم اور برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے اور سوسائٹی کے عام معاشی حالات میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ان کے اثرات ان سب پر ناگزیر طور سے مترتب ہوتے ہیں۔ کیونکہ معاشی تبدیلیاں ذرائع پیداوار

کے استعمال کے نئے طریقوں سے روشناس کر کے انسان کو اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ وہ مادی اشیاء سے اپنے تعلقات کی نوعیت کو اور خود آپس کے باہمی تعلقات کی نوعیت کو بدلے اور اسی کے مطابق اس سیاسی اور قانونی نظام میں تبدیلی پیدا کرے جو ان تعلقات کو معین کرتا ہے۔"[1]

اوپر کے بیان سے دو باتیں صاف ہو جاتی ہیں ایک یہ کہ مارکس کی رائے میں ذہنی افکار و تصورات مادی زندگی کے حالات سے پیدا ہوتے ہیں اور ان حالات کے قائم رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ پھر جب یہ حالات بدلتے ہیں تو انسانی فکر بھی اس تبدیلی سے مطابقت پیدا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس عمل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ قدرت نے انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے وسائل پیداوار کا جو لا انتہا خزانہ جمع کر رکھا ہے۔ اس کا استعمال انسان تدریجی طور پر سیکھتا ہے۔ ہر نئی ایجاد یا دریافت پیداوار کے لا انتہا قدرتی وسائل میں سے بعض ایسے سائل کے استعمال کا راستہ کھول دیتی ہے جس سے کام لینے اور جنہیں کارآمد بنانے کے طریقوں سے انسان اس وقت تک ناواقف ہوتا ہے۔ قدرتی وسائل سے بہرہ مند ہونے کے بعض نئے طریقوں انسان جب واقف ہو جاتا ہے تو اس کی یہی واقفیت کچھ اور مزید انکشافات کا سبب بنتی ہے حتیٰ کہ ایک خاص مدت گزرنے کے بعد جب اس طرح کے انکشافات و ایجادات سے انسان اچھی طرح اپنے گرد و پیش کے نئے وسائل کو استعمال کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو وہ مجبور ہوتا ہے کہ اس معاشی نظام میں تبدیلی پیدا کرے جس کے اندر اب تک وہ کام کر رہا ہوتا ہے کیونکہ پیداوار کے نئے طریقوں سے اسی صورت میں کام لیا جا سکتا ہے جب ان تعلقات کی نوعیت بدل جائے جو انسان اور اشیائے مادی نیز خود انسانوں کے مابین قائم ہیں۔ مروجہ معاشی نظام کے اندر رہ کر نئے انکشافات اور معلومات سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ سوسائٹی کا رائج الوقت ڈھانچہ ان تازہ قوتوں کے عمل کو قبول کرنے میں مزاحم ہوتا ہے۔ اس طرح سے پیداواری قوتوں میں اور حالات پیداوار میں وہ کشمکش رونما ہوتی ہے جس کی وجہ سے طبقوں کی ایک نئی تقسیم عمل میں آتی ہے اس کے ساتھ ہی سیاسی اداروں قانون اور اخلاقی تصورات اور طرز معاشرت میں انقلاب ناگزیر ہو جاتا ہے۔"

خلاصہ یہ نکلا کہ حیاتِ انسانی کے کسی بھی شعبے میں جب کبھی کوئی انقلاب برپا ہوتا ہے اس کا اصلی سبب

---

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام از محمد مظہر الدین صدیقی ص ۱۵۹

وہ معاشی تناؤ ب ہوتا ہے جس کے تحت کوئی تازہ دم نئی معیشت کسی تھکی ہاری پرانی معیشت کو دھکے دے دے کر خانہ بدر کر دیتی ہے۔

مارکس کے اس نظریے میں مذہب کو کسی مستقل اور پائیدار حقیقت کی حیثیت حاصل نہیں بلکہ وہ اپنے اصول و فروع سمیت بدلتے ہوئے حالات کی پیداوار ہے جس کی کل تک اسی شکل میں باقی رہنے کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی ہے۔

مارکسیت وحی الٰہی اور الہام کی معروف حقیقت کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کے خارجی تجربات اس کے تمام علمی تصورات کا ماخذ ہیں۔ اس لئے وہ انسانی حواس و مدرکات کے سوا کسی ذریعۂ علم کو حقیقی تسلیم نہیں کرتی ہے۔

پروفیسر داس گپتا اس بارے میں لکھتا ہے:۔

"علم کا سارا مواد ہمیں عالم مادی کے تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ مختلف تجربات کے باہمی تعامل سے نئے افکار و تصورات پیدا ہو سکتے ہیں جن کا ممکن ہے کہ ہمارے خارجی مدرکات سے کوئی تعلق معلوم نہ ہو۔ لیکن اگر ان افکار و تصورات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے سابقہ تجربات ہی میں سے کوئی نہ کوئی تجربہ ان کا ماخذ اور سرچشمہ ہے۔ الہام ربانی، فکرِ خالص اور وجدان علم کے ذرائع نہیں ہو سکتے یہ محض افسانے ہیں۔ انسان کے تجربات جن کا کبھی وہ شعور رکھتا ہے اور کبھی نہیں رکھتا۔ لیکن وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے میں حاصل کرتا رہتا ہے اس کے تمام تصورات و نظریات کا مواد ہیں۔ جب وہ انہیں عملی دنیا میں آزما لیتا ہے۔ تو یہی تصورات و نظریات علمی حقائق بن جاتے ہیں ایک سائنسدان یا فلسفی اپنے علمی نظریات ان تجربات پر قائم رکھتا ہے جن کا وہ غیر شعوری طور پر حاصل ہوتا ہے لیکن جس چیز کو الہام ربانی کہا جاتا ہے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ کسی لطیف اور حساس ذہن میں اس کے غیر شعوری تجربات جگہ پا لیتے ہیں اور کسی تخلیقی مدعا کے حصول میں اس کی رہنمائی کرتے ہیں جب کبھی یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ کوئی تصورِ خالص کسی تخلیقی عمل یا سائنٹیفک انکشاف کا سبب ہے تو ہوتا یہ ہے کہ خارجی تجربات کا کوئی ذخیرہ کسی ذہین شخص کی بالغ نظر اور اعلیٰ صلاحیت فکر کے

کے ساتھ مل کر ایک نئی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔[1]

مارکسیت کے اندر ہر شے تغیرات کی آماجگاہ ہے اس لئے اس میں کسی دائمی صداقت کے ماننے کی گنجائش ہی نہیں۔ خدا، رسول اور آخرت جیسی تصورات جو تعبیری اختلاف اور کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ مذاہب کا قدر مشترک ہیں اس کے نزدیک لاشئے محض ہیں۔ چنانچہ ان تصورات پر مبنی اخلاقی ضوابط بھی اس کے نزدیک خالی خولی ڈھانچے ہیں جن کے اندر کوئی حقیقی روح کارفرما نہیں۔

مارکسیت کی شہ پاکر لبرلزم کو عمل سے گزر کر علم کی دنیا میں پنجے گاڑھنے کا موقعہ اور مذہبی افکار و اعمال کی بابت کھل کر دریدہ دہنی کی جرأت پیدا ہوئی۔ اشتراکیت کے آوارہ خیالات بھی سمٹ سمٹا کر مادیت اور الحاد کی اس نئی بستی میں کھینچنے لگے۔ اور تھوڑی دیر سستانے کے بعد مکاری و عیاری کے نئے اسلحہ سے لیس ہو کر چار سُو غارت گری کے لئے نکلنے لگے ؛

---

[1] اشتراکیت اور نظامِ اسلام ص۔۲۰۶۔

باب سوم

سوشلزم کی عملی سرگرمیاں

(۱)

جنگِ اقتدار

سوشلزم ابھی تک فکر و نظر کے نہ خانوں میں تکمیل کے مراحل سے گزرتا رہا۔ اگرچہ پرولتاری انجمنوں کے قیام سے اس نے زندگی کے میدان میں تن سازی کی ابتدائی مشقیں شروع کی ہوئی تھیں لیکن کوئی ایک واضح نصب العین اور اس کے طریقۂ وصول کا تعین نہ ہونے سبب ان مشقوں میں کوئی تسلسل اور نظم و نسق موجود نہیں تھا۔ جیسے کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مارکس نے جہاں سوشلزم کو دلیل و برہان کی بنیادیں فراہم کیں وہاں اس کو ایک ہی نصب العین اور اس کو حاصل کرنے کا لگا بندھا عملی پروگرام بھی عطا کیا۔ جس سے اس کی پریشان خیالی میں یک سوئی اور عملی جدوجہد میں انضباط پیدا ہوا۔

مارکس نے اپنے طور پر یہ طے کیا ہوا تھا کہ پرولتاری آمریت ہی سوشلزم کو پوری طرح سے نافذ کرنے کی ضامن ہو سکتی ہے اور اس آمریت کے قیام کے لئے "بورژوائی اقتدار"[1] کا مکمل استیصال ضروری ہے

---

[1] سوشلزم کی اصطلاح میں متوسط طبقہ "بورژوا" کہلاتا ہے۔ سوشلزم اس طبقے کا جانی دشمن ہے اور اس کا استیصال اپنی بقا و استحکام کے لئے ناگزیر سمجھتا ہے۔ دراصل متوسط طبقہ کسی قوم کی ریڑھ کی ہڈی بھی ہوتا ہے اور دل و دماغ بھی۔ یہی طبقہ اسے زندگی کے ہر میدان میں قیادت فراہم کرتا ہے۔ متوسط طبقہ جس قدر قوی اور باشعور افراد پر مشتمل ہوگا۔ قوم اتنی ہی طاقتور اور غیور و جسور ہوگی۔ سوشلزم ..... یہودی تحریک ..... اسے اسی لئے فنا کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے تاکہ غیر یہودی قومیں ذہین اور باشعور اور غیور و جسور قیادت سے محروم ہو جائیں۔ اس نظام میں پرولتاریوں کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اس کے نزدیک انسانی سوسائٹی کے ارتقاء کی بنیاد یہی پرولتاری طبقہ تھا۔ یہودی ذہن کے تراشے ہوئے اس نظام میں پرولتاریوں کو اہمیت اسی لئے دی گئی کہ انہیں خوش آیند اور پرفریب نعروں کے ذریعے آسانی سے اپنے دام خدع و تزویر میں پھانسا جا سکتا تھا پھر جس معاشرے (یورپ کے عیسائی معاشرے) میں سوشلزم کا نظریہ "ابتداءً" پیش کیا گیا اس میں پرولتاری طبقے کی بھاری اکثریت یہودیوں ہی پر مشتمل تھی۔ یورپ میں یہودیوں پر اعلیٰ و ادنیٰ سرکاری ملازمتوں اور تجارت کے دروازے صدیوں سے بند چلے آرہے تھے اس لئے ان کی اکثریت یا تو دست کار اور کاریگر تھی یا مزدور اور محنت پیشہ (باقی اگلے صفحہ پر)

جو طاقت کے استعمال کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ مارکس آپس کی مصالحانہ پالیسی اختیار کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس سلسلے میں وہ کسی آئینی یا جمہوری حل پر یقین رکھتا تھا۔ بالفاظ دیگر وہ اقتدار یا تختہ دار کے سوا کسی تیسری چیز پر قائل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے انہی مجوزہ خطوط پر منظم مارکسیت کا آغاز کیا۔ مارکسیت کے بہت سے ہم نواؤں نے نصب العین یا طریق کار میں اختلاف کی وجہ سے مختلف مرحلوں پر اس کا ساتھ دینا چھوڑ دیا۔ بلکہ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے اور رخنہ اندازیاں کیں لیکن وہ اپنی دھن کا بہت پکا ثابت ہوا۔ اور کسی موقع پر بھی ذہنی تردد یا عملی تعطل کا شکار نہ ہوا۔ اس کی یہ عملی جدوجہد کچھ اس تفصیل کے ساتھ مرحلہ وار جاری رہی ؛

عالمی ارتباط کی مہم

انیسویں صدی کے نصف آخر میں عام طور پر مزدوروں اور ان کے رہنماؤں کو سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی اصلاح سے مایوسی ہو چکی ، اور ان کے دلوں میں اس نظام سے ایک شدید جذبۂ مخالفت پیدا ہوا۔ اس وقت یہ احساس رفتہ رفتہ شدت اختیار کرتا گیا کہ نظام سرمایہ داری کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے کے بغیر عام انسانوں کی مادی فلاح

بقیہ ص منعتی انقلاب آیا تو یہودی کاریگر اور دستکار کارخانوں اور فیکٹریوں میں نوکر ہو گئے۔ اس طرح پرولتاری طبقہ وجود میں آگیا۔ بالفاظ دیگر یورپ میں پرولتاری طبقے کی حکومت کا مطلب تھا یہودیوں کی حکومت چنانچہ سوشلسٹ تحریکوں میں یہودی پرولتاری طبقہ پیش پیش رہا۔ یورپ میں اس طبقے کی قوت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صیہونی تحریک کے بانی ہرزل (HERTZEL) نے قیصر جرمنی سے فلسطین کو یہودی مملکت بنانے کے لئے سودا بازی کرنی چاہی تاکہ وہ ترکی پر دباؤ ڈالے کیونکہ سلطان عبدالحمید فلسطین کی سرزمین یہودیوں کے حوالے کر دینے کے عوض پچاس لاکھ پونڈ دینے کی پیش کش کو پائے استحقار سے ٹھکرا چکے تھے) اس نے قیصر سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے تو میں یورپ میں سوشلسٹ اور ریڈیکل پروپیگنڈہ بند کرا دوں گا (جس کا سب سے زیادہ ہدف جرمنی تھا) لیکن جب قیصر نے کوئی یقین دلانے سے تاخیر کی تو ہرزل نے اسے دھمکی دیتے ہوئے لکھا: "اگر ہمارا کام نہ بنا تو ایک ہی جست میں سینکڑوں انقلابی، انقلابی تحریکوں کے ساتھ جا ملیں گے" ؛ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۲ ص ۱۱
(بحوالہ روس میں مسلمان قومیں ص ۸۶)

اور معاشی اطمینان کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس زمانے سے مزدوروں کی جدوجہد میں انقلابی رنگ نمایاں ہونے لگا۔ ۱۸۴۸ء میں کارل مارکس اور اینجلس نے اپنا مشہور اشتمالی منشور شائع کیا جس میں سرمایہ داری کا خاتمہ کرنے کی غرض سے دنیا کے تمام مزدوروں کو دعوتِ اتحاد دی گئی تھی۔

اس اعلان کے بعد سے یورپ کے ہر ملک میں اشتراکی جماعتوں کا زور ہونے لگا۔ ۱۸۶۴ء میں مختلف ممالک کی اشتراکی جماعتوں کو متحد کرنے کی پہلی کوشش کی گئی۔ اور مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی انجمن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ انجمن "فرسٹ انٹرنیشنل" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ اس کی قیادت کارل مارکس کے ہاتھ میں تھی۔ اسی زمانے میں جرمنی میں معاشرتی جمہوری پارٹی قائم ہوئی جو مارکس کے خالص اشتراکی اصولوں کی حامی تھی۔ لیکن جرمنی میں اس پارٹی کے مقابلے پر مزدوروں کی ایک اور جماعت بھی موجود تھی جس کا رہنما لسال (LASSALE) تھا۔ فرانس میں فرسٹ انٹرنیشنل کو پروڈھان اور بلانکی کے پیروؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ پروڈھان اور اس کے حامی نراجی ذہنیت رکھتے تھے اور بلانکی انقلاب برپا کرنے کے لئے عوام الناس کی تائید و اعانت غیر ضروری سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ایک معتدبہ اقلیت بھی طبقاتی شعور و احساس سے بہرہ مند ہو جائے تو انقلابی اقدام کے لئے اور کسی امر کی حاجت نہیں۔

فرسٹ انٹرنیشنل کو صرف بیرونی حریفوں کا سامنا ہی نہ تھا۔ بلکہ اس میں اندرونی اتحاد کی بھی کمی تھی۔ انگلستان کی جانب سے جو نمائندے شریک تھے۔ وہ زیادہ تر انگریز مزدوروں کے انجمنوں کے رہنما تھے جو انجمنوں کے طریق کار کو اشتراکی مقاصد کے حصول کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے اور ان طریقوں کو براعظم یورپ میں پھیلانا چاہتے تھے۔ اس کے اطالوی نمائندوں میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت میزینی (MAZZINI) کی تھی مگر وہ ایک جمہوریت پسند تھا جو اطالیہ کی آزادی کے لئے لڑ رہا تھا۔ اور محض اس خیال سے اس بین الاقوامی انجمن میں شریک ہوا تھا کہ اس کے ذریعے اطالیہ کی جمہوری تحریک کے لئے بین الاقوامی تائید و حمایت حاصل کرے۔ روس کی طرف سے باکونین (BAKUNIN) فرسٹ انٹرنیشنل میں شریک ہوا۔ وہ ایک بڑی متحرک شخصیت کا حامل تھا لیکن وہ پکا نراجی اور خفیہ سازشوں کے فن کا ماہر تھا۔ اس لئے کارل مارکس سے اس کی نبھ نہ سکی دونوں کے مقاصد اور طریق کار میں بڑا اختلاف تھا۔ کارل مارکس کی قیادت کے باوجود اندرونی اور بیرونی مخالفت کے باعث فرسٹ انٹرنیشنل کی عملی جدوجہد کمزور پڑ گئی۔ اور ۱۸۷۲ء میں نیویارک کو اس انجمن کا مستقر بنا دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ براعظم یورپ سے اس کا تعلق برائے نام رہ گیا۔ بالآخر ۱۸۷۶ء میں فرسٹ انٹرنیشنل کو

برخاست کیا گیا۔

فرسٹ انٹرنیشنل کے خاتمے کے بعد براعظم یورپ کی اکثر ممالک کی حکومتوں کی جانب سے اشتراکی تحریک کو دبانے اور طاقت مٹانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ فرانس میں اکثر اشتراکی لیڈروں کو قید یا جلا وطن کر دیا گیا۔ جرمنی میں بھی اشتراکی تحریک کو کچلنے کے لئے متعدد سخت گیر قوانین وضع کئے گئے۔ اسی درمیان میں جرمنی کی اشتراکی جماعت میں جو مغربی یورپ کی اشتراکی جماعتوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور بااثر تھی، ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوئی جس نے اشتراکیت کی انقلابی روح کو سخت نقصان پہنچایا۔

۱۸۷۵ء میں جرمن معاشرتی جمہوری پارٹی جو مارکس کے اصولوں پر قائم ہوئی تھی لسال کی جماعت سے مل گئی۔ یہ اتحاد ایک ایسے مشترکہ پروگرام کی بنا پر عمل میں آیا جس میں دونوں فریقوں کے نظریات کی رعایت کی گئی تھی۔ یہ مشترکہ پروگرام "گوتھا پروگرام" کہلاتا تھا۔ مارکس کو یہ مصالحت پسند نہ آئی اور اس نے گوتھا پروگرام پر سخت تنقید کی۔ واقعہ یہ تھا کہ مارکس اور لسال کے درمیان نظریات کا بنیادی فرق تھا۔ لسال تدریجی اصلاح کا قائل تھا۔ اور صنعت و حرفت میں حکومت کی مداخلت کے ذریعے سے مزدوروں کے مفاد طلب قوانین نافذ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برخلاف مارکس کا پروگرام یکسر انقلابی تھا اور وہ سرمایہ دار حکومتوں سے مزدوروں کے لئے رو رعایت نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد جرمنی کی معاشرتی جمہوری پارٹی نے تدریجی اشتراکیت کا مسلک اختیار کر لیا۔ اور اس کا انقلابی رنگ بالکل اڑ گیا۔ دوسرے مغربی ممالک کے اشتراکی جماعتوں کا بھی کم و بیش یہی حال رہا۔[1]

مزدوروں کی دوسری بین الاقوامی انجمن

(سیکنڈ انٹرنیشنل)

۱۹۰۱ء سیکنڈ انٹرنیشنل یا مزدوروں کی دوسری بین الاقوامی انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن اس انٹرنیشنل کو کارل مارکس کے انقلابی پروگرام سے کوئی سروکار نہ تھا۔ کیونکہ اس کے اراکین زیادہ تر مغربی یورپ کی اشتراکی جماعتیں تھیں جنہوں نے انقلابی طریق کار کو چھوڑ کر آئینی طریق کار اختیار کر لیا تھا۔ یہ جماعتیں اپنے ممالک کی پارلیمنٹوں میں شریک تھیں اور پارلیمانی اکثریت حاصل کر کے سرمایہ دارانہ نظام میں تدریجی اصلاح کرنا چاہتی تھیں۔ علاوہ انہیں ان پر قومی رنگ بہت غالب تھا اور جو کچھ بین الاقوامیت ان میں باقی

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام

رہ گئی تھی وہ صرف اس حد تک تھی کہ یہ جماعتیں جنگ کی مخالف تھیں اگرچہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عالمگیر شروع ہوجانے کے بعد انہوں نے نظریات کو بالائے طاق رکھ کر اپنی قومی حکومتوں کا ساتھ دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

مغربی یورپ میں کارل مارکس کے انقلابی طریقِ کار کو مقبولیت نصیب نہ ہوسکی۔ اور نہ اشتراکیت مظلوم طبقات کا وہ بین الاقوامی اتحاد پیدا کرسکی جس کے متعلق مارکس اور اینجلس نے اشتمالی منشور میں پیشین گوئی کی تھی۔ مغربی یورپ کے اشتراکی پارٹیوں پر تدریجیت اور قومیت کا اثر غالب رہا۔ انگلستان میں اشتراکیت کو اتنا فروغ بھی حاصل نہ ہوا جتنا برِاعظم یورپ کے ممالک میں۔ کیونکہ وہاں مزدوروں کی انجمنوں اور ان کے مخصوص طریقِ کار نے ایک جداگانہ ذہنیت پیدا کردی تھی جو اشتراکی اثرات کی ترقی میں مانع تھی۔ صرف روس ایک ایسا ملک تھا جہاں مارکس کے نظریات کو اور اس کے انقلابی طریقِ کار کو خوب فروغ ہوا اور اس کی بنا پر ایک زبردست انقلابی تحریک وجود میں آئی۔ لیکن مارکس کو اپنی زندگی میں اس انقلابی پروگرام کی مقبولیت اور کامیابی دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

روسی محنت کشوں کی بیداری

قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے دیگر ممالک کی طرح روس میں بھی جاگیرداری نظام قائم تھا۔ اس نظام کی استـ نیم غلام کاشتکاروں کی محنت اور عرق ریزیوں کی رہینِ منت تھی۔ ۱۸۶۱ء میں جنگِ کریمیا کے بعد روس میں نیم غلام کاشتکاروں کو آزادی دے دی گئی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان سے جو جبری محنت لی جاتی تھی وہ کچھ زیادہ بار آور ثابت نہیں ہوئی۔ بہرحال اس آزادی کے بعد کاشتکار اور زمیندار کا تعلق غلام اور آقا کا نہیں رہا۔ مگر اس سے کسانوں کو کوئی معاشی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ کیونکہ زمینیں اب بھی زمینداروں کے قبضے میں تھیں۔ اور کاشتکار جو اراضی کاشت کے لئے حاصل کرتے تھے۔ اس کا لگان انہیں جنس کی صورت میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ جس کی مقدار پیداوار کا نصف تھا۔ اس لگان کے علاوہ کاشتکاروں کو اور محاصل بھی دینے پڑتے تھے جس کے بعد انہیں مشکل سے دو وقت کی روٹی میسر آتی تھی۔ زمینداروں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اور محاصل کے بار سے مفلس و قلاش ہو کر کسانوں نے بڑی تعداد میں گاؤں کی سکونت ترک کرکے شہروں میں آباد ہونے کی کوشش کی جہاں نئی نئی صنعتیں قائم ہورہی تھیں۔ ان صنعتوں میں کسانوں کو

[1] اشتراکیت اور نظامِ اسلام

مزدوروں کی حیثیت سے جذب کرلیا گیا۔ اس طرح سرمایہ داروں کو محنت کرنے والے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد سستے داموں حاصل ہوگئی۔

نیم غلام کاشتکاروں کی آزادی کے بعد روس میں ۱۸۶۵ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان صنعتی سرمایہ داری کی ابتدا اور ترقی ہوئی اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد سات لاکھ چھ ہزار سے چودہ لاکھ اور ...تیس ہزار ہوگئی۔ ۱۸۹۰ء کے بعد سے بڑے پیمانے کی صنعتوں کو اور زیادہ فروغ ہوا اور ریلوں کی تعمیر شروع ہوئی جس سے نہ صرف ملک کی اندرونی تجارت پر اچھا اثر پڑا بلکہ کوئلہ اور دھاتوں کی صنعتوں نے بھی خوب ترقی کی۔

صنعت کی اس ترقی کے باوجود روس کی بیشتر آبادی زراعت پیشہ تھی جو قدیم طرز و رواج کے مطابق چھوٹے چھوٹے قطعاتِ اراضی پہ الگ الگ کھیتی باڑی کرتی تھی۔ کاشت کا طریقہ انفرادی تھا۔ اس سے پیداوار کا اوسط بہت کم تھا۔ چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کے علاوہ روس میں مالدار کسانوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی جو (KULAK) کہلاتے تھے۔

سرمایہ داروں اور زمینداروں کی حکومت نے کام کرنے والے عوام پہ بہت ظلم ڈھائے۔ ۲۸۰۰۰ زمینداروں کے پاس ۱۶،۷۰،۴۰،۰۰۰ (سولہ کروڑ ستر لاکھ چالیس ہزار) ایکڑ زمین تھی اور ایک کروڑ کسانوں کے پاس صرف انیس کروڑ ستر لاکھ دس ہزار ایکڑ زمین تھی۔ پہلی جنگِ عظیم سے پہلے ایک تجارتی ادارہ پروڈامٹ (PRODAMET) ملک کی اسّی فیصد سے زائد لوہے اور فولاد کی پیداوار کی تجارت پر قابض تھا اسی طرح آئل شیل (OIL SHELL) اور نوبل (NOBEL) کے تجارتی ادارے سارے تیل کی صنعت کے مالک تھے[1]

۱۹۱۷ء میں ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ آدمی فوج میں تھے جس کی وجہ سے دیہی علاقوں میں مزدوروں کی کمی واقع ہوئی اور تقریباً ایک تہائی کھیت نگرانی کے بغیر رہ گئے۔ پیداوار بہت کم ہوگئی۔ قرضہ بہت زیادہ بڑھ گیا جنگ کے دوران بہت سے کسان غریب تر ہوگئے جب کہ مٹھی بھر کسان امیر تر ہوگئے[2]

۱۸۷۰ء میں روسی مزدوروں میں بیداری کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے کیونکہ ان پر سرمایہ داروں کے

History of October Revolution, P. 13

P. 14

مظالم بہت سخت ہو گئے تھے۔ روس کے کسی کارخانے میں اوقات کار ساڑھے بارہ گھنٹے سے کم نہ تھے۔ بچوں اور بڑوں میں کام کے اوقات کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا اور عورتوں کو مزدوروں کے مقابلے میں بہت کم اجرت دی جاتی تھی۔ کارخانوں کی طرف سے مزدوروں کو رہائش کے لئے جو مکانات ملتے تھے وہ بے حد تنگ و تاریک ہوتے تھے۔ اکثر اوقات ایک چھوٹے سے کمرہ میں بارہ بارہ مزدوروں کو رکھا جاتا تھا۔ اور انہیں اس بات پر بھی مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنی ضروریات کی اشیاء کارخانہ سے متعلق دکان سے خریدیں جہاں انہیں ہر چیز دوگنی یا تین گنی قیمت پر فروخت کی جاتی تھی۔ ان حالات سے تنگ آ کر مزدوروں نے باہمی اتحاد و یک جہتی اور اشتراک عمل کو مؤثر بنانے کی غرض سے اپنی انجمنیں قائم کرنی شروع کیں۔ ۱۸۷۵ء میں اوڈیسا (ODESSA) کے مقام پر جنوبی روس کے مزدوروں کی انجمن قائم ہوئی۔ ۱۸۷۸ء میں شمالی روس کے مزدوروں کی انجمن کا قیام سینٹ پیٹرز برگ میں عمل میں آیا۔ اس انجمن کا صدر اور رہنما ابنارسکی (OBNORSKY) تھا جو وسطی یورپ کے معاشرتی جمہوری پارٹیوں کے کام اور مارکسی اصولوں سے واقف تھا۔ یہ انجمنیں لاریح الوقت سیاسی نظام کا خاتمہ کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کا فوری مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کے لئے آزادیٔ تحریر و تقریر، آزادیٔ اجتماع، انجمن سازی اور دیگر سیاسی اور معاشرتی مراعات حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ اور اوقاتِ کار میں کمی کرائیں۔

چنانچہ ۱۸۸۰ء کے بعد روس میں ہڑتالوں کا دور شروع ہوا۔

۱۸۶۱ء کی اصلاحات کے ذیل میں غالباً اہم ترین فیصلہ یہ تھا کہ یہودی دست کاروں، کالج کے گریجوایٹوں اور مالدار تاجروں کو خالص روس میں رہنے کی اجازت دی گئی۔ اب تک یہ لوگ روس کے مقبوضہ علاقوں میں رہتے تھے۔ روسی پولینڈ میں ان کی بہت بڑی آبادی تھی۔[1] اس آبادی کو ایک خاص علاقے میں یکجا کر دیا گیا تھا جو تاریخ میں (Pale of Settlement) کہلاتا ہے۔ یہاں کے یہودی مشرقی اور وسطی یورپ میں یہودیوں کی قیادت میں اٹھنے والی تحریکوں سے متاثر تھے۔ یہ لوگ جب اس اجازت کے تحت روس کے پایۂ تخت

---

[1] روس میں یہودیوں کی آبادی دنیا میں سب سے زیادہ تھی۔ صیہونی تحریک کے بانی، اسے چلانے اور مکروہ ہتھکنڈوں سے کامیابی سے ہمکنار کرنے اور اسرائیل کی ریاست وجود میں لانے والے سب روس کے مقبوضہ یورپی علاقوں کے یہودی تھے۔ ان میں سے اکثر وہ تھے جنہوں نے بالشویک انقلاب لانے میں بھی حصہ لیا تھا۔

اور دوسرے بڑے شہروں میں پہنچے تو ان افکار کو اپنے ساتھ لے کر آ گئے۔ کارخانوں، فیکٹریوں، یونیورسٹیوں میں طلبہ حلقے اور سیل قائم ہو گئے۔ خفیہ جماعتوں نے مار دھاڑ، قتل و غارت اور دہشت پسندی کا بازار گرم کر دیا۔ الیگزینڈر دوم انہی یہودی دہشت پسندوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ الیگزینڈر سوم (۱۸۸۱ء — ۱۸۹۴ء) کے عہد میں باقاعدہ جماعتیں وجود میں آ گئیں۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی جو بعد میں بالشویک اور پھر سوشلسٹ پارٹی کہلائی اسی زمانے کی پیداوار تھی۔ یہ پارٹی پہلے پہل روس سے باہر ۱۸۸۲ء میں ایک گروپ کی صورت میں قائم ہوئی پلیخانوف اس گروپ کا لیڈر تھا۔ ۱۸۹۸ء میں اس نے روس کے اندر باضابطہ طور پر پارٹی کی بنیاد رکھی۔

○

زارِ شاہی استبداد کا سامنا

اس سے پہلے کہ روس میں سوشلزم کی انقلابی جدوجہد کا جائزہ لیا جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زارِ شاہی روس کا مختصر سا تاریخی پس منظر اور اس کی مستبدانہ کارروائیوں کی روئداد بیان کی جائے تاکہ اس کی مدد سے اس عام بے چینی اور چار سو پھیلی ہوئی افراتفری کے مضمرات کو آسانی سے سمجھا جا سکے جس کی وسعتوں میں سوشلزم کی انقلابی تحریک کو نشو و ارتقاء کا موقعہ ملا۔

اس وقت کا روس مغرب میں ترکی کی سرحد اور بحرِ اسود کے ساحل سے مشرق میں مشرقی ترکستان (سنکیانگ) تک اور شمال میں سائبیریا کے سٹیپ کے میدانوں سے جنوب میں ایران و افغانستان کی سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ وسیع و عریض علاقہ مغربی ترکستان، داغستان (شمالی قفقاز) ایدل اورال، کریمیا، شمالی آذربائیجان اور سائبیریا کی مغربی اضلاع پر مشتمل تھا۔[1]

کشور کشائی کا جنون

زاروں کی اس عظیم الشان سلطنت کی ابتداء ماسکووی کی اس چھوٹی سی ریاست سے ہوئی تھی جو وہاں کے ایک جاگیردار الیگزینڈر نووسکی کے بیٹے آئیوان اول (۱۳۲۵ء — ۱۳۴۱ء) نے کچھ مغربی اور شمالی علاقے ہتھیا کر قائم کی تھی جس کا رقبہ پانچ سو مربعہ میل تھا۔[2]

---

[1] سرخ اندھیروں میں [2] روس میں مسلمان قومیں ص ۳۴

آئیوان اول کے بیٹے سائمن (۱۳۴۱ء — ۱۳۵۹ء) نے ماسکووی کی حدود پھیلانے اور گرد و پیش کے علاقے نگلنے کا کام جاری رکھا۔ سائمن کا بیٹا دیمتری (۱۳۵۹ء — ۱۳۸۹ء) باپ سے بھی بڑھ کر حوصلہ مند تھا اس نے اپنی ریاست کو مزید وسعت دی۔ لیتھونیوں کے حملے کامیابی سے روکے اور تاتاری مسلمانوں سے کشمکش چھیڑ دی۔ ۱۳۸۰ء میں دریائے ڈان کے کنارے تاتاریوں کے ساتھ تصادم میں ماسکو نے پہلی مرتبہ اپنی بڑھتی ہوئی قوت کا مظاہرہ کیا۔ تاہم دیمتری اس تصادم کو اپنے منطقی انجام تک نہ پہنچا سکا۔ تیمور کے عروج نے اسے دریائے ایدل (والگا) کے مشرق اور جنوب کی جانب بڑھنے سے روک دیا۔ ماسکووی نے اب مغرب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔[1]

۱۴۶۲ء سے ۱۵۰۵ء تک کا زمانہ روس کی تاریخ میں نقطۂ تغیر سمجھا جاتا ہے۔ یہ آئیوان سوم کا دورِ حکومت تھا جس کے عہد میں ماسکو کی مختصر سی جاگیر بہت وسیع سلطنت بن گئی۔ اس کارنامے کی بنا پر آئیوان سوم، آئیوان اعظم (IVAN THE GREAT) کہلاتا ہے۔ وہ ماسکو کا پہلا حکمران تھا جس نے زار (قیصر) کا لقب اختیار کیا۔ آئیوان سوم نے اپنی مختصر سی سلطنت جدید خطوط پر استوار کی۔ فوج کو از سر نو منظم اور آتشیں اسلحہ سے مسلح کیا۔ اور پھر اس کا اقتدار آکاس بیل کی طرح گرد و پیش کے علاقوں میں پھیلنے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ایدل اورال کی ازبک سلطنت افتراق و تشتت کا شکار ہو رہی تھی۔ مغربی علاقے میں تین سلطنتیں قازان، استرخان اور کریمیا قائم ہو چکی تھیں۔ مشرقی علاقے میں قازق تھی۔ آئیوان سوم نے قازان کو خراج دینے سے انکار کیا۔ ۱۴۷۳ء سے ۱۵۴۹ء تک ۷۶ برس کے عرصے میں ماسکو اور قازان کے درمیان بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر آئیوان چہارم (Ivan the Terrible) نے ۱۵۵۲ء میں جرمنی اور سویڈن کے فوجی انجینیروں کی مدد سے قازان پر غلبہ حاصل کر لیا۔ سال بھر کے اندر روسی افواج دریائے ایدل (والگا) اور ماوراء ال کے پورے علاقے پر چھا گئیں۔ ۱۵۵۶ء میں روس نے استرخان پر بھی قبضہ کر لیا۔[2]

اس کے بعد روسی افواج نے سائبیریا کا رخ کیا۔ سائبیریا اس وقت دو تاتاری خوانین سلطان یادگر اور کشم خان کی رزم گاہ بنا ہوا تھا۔ ۱۵۵۸ء میں آئیوان چہارم نے نوو گراڈ کے ایک متمول تاجر گریگوری سٹراگانوف کو سائبیریا کا بہت بڑا علاقہ برائے نام شرائط پر بخش دیا۔ سٹراگانوف نے جرائم پیشہ کاسکوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی

---

[1] روس میں مسلمان قومیں ص ۳۷ [2] روس میں مسلمان قومیں ص ۳۶

اور مضبوط فوج بنائی اور مسلمانوں پر دست درازیاں شروع کر دیں۔ بخارا کے امیر عبداللہ خان نے کشم خان کو بار بار سمجھایا کہ وہ کافروں کا مقابلہ کرنے کے لئے مقامی خوانین کے ساتھ امن و صلح سے رہے۔ لیکن کشم خان نے اس پند و نصیحت پر کان نہ دھرے۔ وہ اپنے حریفوں کو تو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا مگر اس دوران ایک قوی تر دشمن اس کی مملکت میں قدم جما چکا تھا۔ کشم خان اور اس کے بیٹوں علی خان اور الیشم خان روسیوں کو سائبیریا سے نکال باہر کرنے کے لئے چالیس برس تک جد و جہد کرتے رہے لیکن ناکام ہوئے۔ ۱۵۹۸ء میں یہ تیسری مسلمان سلطنت بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔[1]

اٹھارہویں صدی میں کوہستان اورال سے تن شان تک اور سائبیریا سے ترکستان کے صحراؤں تک پھیلے ہوئے وسیع و عریض سٹیپ (STEPPES) روس کے جارحانہ عزائم کی جولانگاہ بنے ہوئے تھے۔ یہ میدان خانہ بدوش قازق قبائل کی ملکیت تھی۔ یہ قبائل چار لشکروں سے تعلق رکھتے تھے جو ہر وقت بہترین مرغزاروں پر قبضہ کرنے کے لئے آپس میں لڑنے بھڑنے میں مصروف تھے۔ ادھر مغربی منگولیا کے بدھ جنگاری قبائل ان پر تاخت کر رہے تھے۔ روسی سامراج کے لئے اس سے بہتر وقت اور کیا ہو سکتا تھا۔ وہ جنوب اور مشرق کی طرف بڑھا اور کسی بڑی مزاحمت کے بغیر ۱۷۱۹ء تک بہت بڑے علاقے پر مسلط ہو گیا۔ اس زمانے میں جنگاری اور کالمک قبائل کے حملے قازقوں پر سنگین صورت اختیار کر گئے۔ انہوں نے روسیوں سے تحفظ کی درخواست کی۔ روسیوں نے اس خدمت پر آمادگی ظاہر کی۔ ۱۷۴۲ء تک چاروں لشکر ان کی حفاظت میں آچکے تھے۔ یہی حفاظت بتدریج ان قبائل کی غلامی میں تبدیل ہو گئی۔[2]

استرخان پر قبضہ کرنے کے بعد کریمیا روسی سامراج کی ہوسناک نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں کے تاتاری قبائل اپنی آزادی کے لئے روسیوں سے تقریباً دو سو سال تک نبرد آزما رہے۔ تاتار خان کریم گیری نے کئی مرتبہ روسیوں کے دانت کھٹے کئے۔ آخر ۱۷۷۴ء میں کوچک قائنرجی کا معاہدہ طے پایا۔ جس کی رو سے عثمانی سلطنت اور روس دونوں نے کریمیا کو آزاد ریاست تسلیم کر لیا۔ لیکن یہ نام نہاد آزادی کریمیا کو ترکوں سے کاٹ دینے اور انکی تائید و حمایت سے محروم کر دینے کا حربہ تھی۔ کریمیا کے خان عملاً روسی زاروں کے کٹھ پتلی بن گئے۔ ان کے خلاف تاتاری مسلمانوں نے پہلے ۱۷۷۸ء اور ۱۷۸۲ء میں بغاوت کی جسے دونوں مرتبہ روسی فوجوں نے کچلا۔ آخر ۱۷۸۳ء

---

[1] روس میں مسلمان قومیں ص ۳۷، ۳۸ [2] ایضاً ص ۳۸

روسیوں نے پورا جزیرہ نما روسی سلطنت میں شامل کر لیا۔[1]

اب روسی سامراج داغستان کی طرف بڑھا۔ داغستان کی جنگیں روسی سامراج کے مقابلے میں مسلمانوں کی مزاحمت کا حیران کن اور عظیم الشان نمونہ ہیں۔ اہلِ داغستان ۱۵۹۴ء سے ۱۸۵۹ء تک ملک کے چپے چپے کے لئے جنگ کرتے رہے۔ داغستان کی مریدیہ تحریک نے تقریباً ۵۰ سال تک روسی سامراج کا مقابلہ کیا۔ امام شامل آخری دینی رہنما تھے جنہوں نے ۱۸۳۴ء سے ۱۸۵۹ء تک مسلسل ۲۵ برس روسیوں سے جنگ کی اور انہیں تگنی کا ناچ نچاتے رکھا۔ روس کے ایک فوجی مورخ جنرل فادسیف نے داغستان کی لڑائیوں کے بارے میں لکھا ہے۔

"کوہستان قفقاز کے باشندوں کے ساتھ لڑائی میں ہمیں اتنے لشکر سے ہاتھ دھونا پڑے جو ہندوستان سے جاپان تک پھیلے ہوتے ملک کو فتح کرنے کے لئے کافی تھا۔"[2]

امام شامل ان کے اہل خاندان اور مٹھی بھر ساتھی جو زندہ بچ رہے تھے گرفتار کر لئے گئے اور داغستان ایک عظیم الشان اور طویل مزاحمت کے بعد روسی سامراج کا غلام بن گیا۔[3]

اٹھارہویں صدی عیسوی میں روسی سامراج نے آذربائیجان میں اپنے پنجے گاڑھنے شروع کئے۔ روسی سامراج نے یہاں کے ریاستی حکمرانوں میں انتشار اور عدم اعتماد کا بیج بو دیا اور پھر ایک ایک کر کے روس میں مدغم کر دیا۔[4]

قازان اور استرخان پر قبضہ کرتے ہی روسی سامراج نے مغربی ترکستان پر بھی دست درازیاں شروع کی تھیں۔ اٹھارہویں صدی میں جب ترکستانیوں کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور مقامی ریاستیں باہمی مناقشات میں الجھ گئیں تو ۱۷۲۰ء میں روس نے سائبیریا اور اورن برگ کی طرف سے یلغار کی۔ ترکستانی تقریباً سو برس تک کامیاب مزاحمت کرتے رہے۔ ۱۸۶۴ء میں روس نے چمکند پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۶۵ء میں تاشقند فتح کر لیا۔ اس کے دو سال بعد بخارا پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۶۸ء میں سمرقند بھی ترکستانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۱۸۷۳ء میں خیوا نے دم توڑ دیا۔ ۱۸۷۵ء میں روسی خوقند پر چڑھ دوڑے۔ اور ایک زبردست جنگ کے بعد ترکستان میں ملت اسلامیہ کا آخری مضبوط حصار بھی سرنگوں ہو گیا۔ اب وہ ترکمانستان کی طرف متوجہ ہوئے۔ مرو آخری بڑا شہر تھا جو

۱؎ روس میں مسلمان قومیں صہ ۳۹ ۲؎ جنرل فادسیف کا مقالہ، مجلہ قفقاز میونخ ۱۹۵۲ء جلد ۱ عدد ۶ صہ ۹

۳؎ " " " ۴۱، ۴۲ ۴؎ روس میں مسلمان قومیں صہ ۴۲، ۴۳ باختصار

۱۸۸۴ء میں دشمن کے ہاتھ لگا۔ ۱۸۸۵ء تک روس پورے مغربی ترکستان پر مسلط ہو چکا تھا۔ قازق اور فرغانہ کو اس نے براہ راست اپنا صوبہ بنا لیا۔ بخارا اور خیوا کی ریاستیں برقرار رکھیں اور انہیں زیر حمایت علاقوں کی حیثیت دے دی۔ اس طرح سوا تین سو برس کے اندر اندر ماسکووی کی بے مایہ جاگیر ایک زبردست سامراجی قوت بن گئی۔[1]

مذہبی عدم رواداری

روسی قیصریت نے ملک گیری کے شوق میں دور دراز کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مزاحمت کرنے والوں میں سے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور لاکھوں کو اپنا وطن چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کیا۔ باقی ماندہ لوگوں کے ساتھ اس کا کیا سلوک رہا۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے زار شاہی روس کی دینی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی ترجیحات کا سرسری مطالعہ ہی کافی ہو سکتا ہے۔

زار روس یوں تو اپنی ساری رعایا کا شہنشاہ تھا لیکن وہ آرتھوڈکس کلیسا کا محافظ بھی تھا چنانچہ تمام لوگوں سے یکساں سلوک کے دعووں کے باوجود آرتھوڈکس کلیسا کے پیروکار ترجیحی سلوک کے مستحق قرار پاتے۔ لیکن اس پر بس نہیں۔ حکومت آرتھوڈکس کلیسا کی اس مذہبی عدم رواداری کی سرپرست بھی تھی۔ جس کی بدولت دوسرے مذاہب کے لوگوں کو تبدیلی مذہب پر مجبور کیا جاتا تھا۔ چونکہ روسی مقبوضات کے زیادہ تر باشندے مسلمان ہی تھے اس لئے انہی کے مذہب و تاریخ کو بدلنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی مہم میں حکومت کا کتنا حصہ تھا اس کا اندازہ کرنے کے لئے مشتے نمونہ خروارے ایدل اورال کے تاتاری علاقے میں اس مہم کی تفصیلات خود روسی حکومت کی رپورٹ میں سنیئے:۔

اس علاقے پر روس نے ۱۵۵۲ء میں قبضہ کیا۔ ۱۵۵۵ء میں ایک روسی بشپ گورئیس نے عیسائیت پھیلانے کا کام شروع کیا۔ تاتاریوں نے اس کی شدید مزاحمت کی۔ انتظامیہ نے مشنری سرگرمیوں کو ہر ممکن تقویت پہنچائی۔ ۱۵۵۶ء میں تاتاریوں نے بغاوت کر دی۔ مگر ناکام رہے۔ اس ناکامی کے بعد حکومت نے تاتاریوں کو جو عیسائیت قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے شہر قازان میں رہنے کی ممانعت کر دی اور شہر کی مسجدیں یا تو

۱؎ روس میں مسلمان قومیں صہ ۴۳، ۴۴

بند کردیں اور یا مسمار۔ ۱۵۹۳ء میں فرمان جاری کیا گیا کہ تاتاریوں کی تمام مسجدیں مسمار کر دی جائیں۔ اور آئندہ حکومت روس کی اجازت کے بغیر کوئی مسجد تعمیر نہ کی جائے لیکن تاتاری اپنے دین کے وفادار رہے[۱]

تاہم مشنریوں نے حکومت کی پشت پناہی میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں تاتاری مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی گوناگوں تدبیریں اختیار کی جاتی رہیں۔ چنانچہ روسی حکومت نے اوقاف پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح بے شمار مسجدیں اور مدرسے مالی وسیلے سے محروم ہو جانے کے باعث بند ہو گئے۔ مقصد یہ تھا کہ تاتاری بچوں کو دینی تعلیم نہ ملے گی تو وہ عیسائیت کا آسانی سے شکار ہو سکیں گے۔ ۱۷۱۳ء میں پیٹر اول نے ایداورال میں یہ فرمان جاری کیا کہ جو غیر روسی چھ مہینے کے اندر عیسائیت قبول نہ کریں گے ان سے اراضی چھین لی جائے گی[۲]

تبدیلیٔ مذہب کے سلسلے میں یہ جبر و ظلم صرف مسلمانوں کے مقابلے میں روا نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ خود عیسائیت کے دوسرے فرقے بھی اس سے محفوظ نہیں تھے۔ لیتھونیا کے سرحدی علاقے میں زیادہ تر کیتھولک فرقہ کے پیروکار آباد تھے۔ یہاں ۱۸۳۹ء میں وحدانی کلیسا کو ختم کر دیا گیا۔ یوکرین کے علاقے کولم میں اسے ۱۸۷۵ء میں نابود کر دیا گیا اور اس کے پیروکاروں کو آرتھوڈکس کلیسا میں واپس لے لیا گیا۔ انیسویں صدی کے پانچویں عشرے میں لیتویا اور استونیا کے کئی ہزار پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو آرتھوڈکس کلیسا کے عقائد تسلیم کرنے پر مجبور کیا گیا۔ روسی آرتھوڈکس پادریوں نے جارجیا کے علیحدہ کلیسا پر کنٹرول حاصل کرنے کی بھی کوشش کی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ عظیم پیٹر کے زمانے سے ہی افسر شاہی نے کلیسا کے معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ پیٹر دی گریٹ نے جو دینی تنظیم قائم کی تھی اس کا سربراہ ایک عام افسر ہی تھا۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ لوگوں کے مذہب تبدیل کرانے کی تحریکوں میں کلیسا سے زیادہ حکومت کا ہاتھ تھا۔ روس کے دو آخری شہنشاہوں الیگزینڈر سوئم (۱۸۸۱ء–۱۸۹۴ء) اور نکولس دوئم (۱۸۹۴ء–۱۹۱۷ء) کے بارے میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ کلیسا کی عدم رواداری کی پالیسی کے مقلد تھے[۳]

جنگل کا قانون ۔ سیاسی طور پر زار شاہی روس میں جنگل کا قانون نافذ تھا۔ روس کی وسعتیں با ضمیر

---

۱ Sergie A Zinkovsky : 1 Pan Turkism & Islam In Rusia (1960) P. 15

۲ روس میں مسلمان قومیں ص ۵۱۔ ۳ از ہیوگ سیٹن واٹسن مترجمہ طلیس عابدی ص ۲۶

افراد و اقوام کے لئے بڑی تنگ تھیں یہاں کسی کو حکومت کی پالیسیوں پر جائز تنقید کرنے کا حق بھی نہیں تھا۔ رعیت کی حیثیت زرخرید غلاموں کی تھی جس کو ہر وقت زارِ شاہی آقا کے سامنے دست بستہ کھڑے ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ترکستان کے فاتح جنرل کافمین نے ایک موقع پر اعلان کیا کہ زار روس سب سے بڑا حاکم ہے جسے اللہ نے اپنی مسلمان رعایا پر حکومت کرنے کے لئے نامزد کیا اور اسے اور اس کے دنیوی نمائندے گورنر جنرل کو وہ تمام خصوصی اختیارات دے دیئے ہیں جو خلفاء استعمال کیا کرتے تھے[۱]

ایک روسی جنرل ایوانوف نے اپنے ماتحت حکام کو یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ مقامی لوگوں پر کسی حالت میں بھی رحم نہ کریں۔ ان پر سیاسی کوڑے برساتے رہیں اور انہیں ہر وقت روسی مُکّے سے مرعوب رکھیں۔ تاکہ وہ روسی برتری کے سامنے سرنگوں رہیں اور اس کے خلاف آواز تک نہ اٹھا سکیں[۲]

روسی حکام کو مقبوضہ مسلمان علاقوں میں غیر محدود اختیارات حاصل تھے یہ اختیارات ضلعی افسر سے لے کر گورنر جنرل تک ہر سطح پر ایک ہی ہاتھ میں مرکوز تھے۔ مثلاً ضلعی افسر، پولیس کا سربراہ، ضلع میں متعین فوجی دستوں کا کمانڈر، دیسی عدالتوں کا پریذائیڈنگ مجسٹریٹ اور ضلع کا منتظم اعلیٰ ہوتا تھا۔ گورنر جنرل کو قانون سازی نظم و نسق برقرار رکھنے، معافی دینے اور ہمسایہ ریاستوں سے جنگ و صلح کا اعلان کرنے کے مکمل اختیارات حاصل تھے۔ ان اختیارات کو حکام حسب خواہش استعمال کرتے اور کوئی احتساب کرنے والا نہ تھا[۳]

سیاسی ظلم و ستم کا پورا پورا اندازہ ۲۲ جنوری ۱۹۰۵ء کے اس واقعہ سے ہوتا ہے جس میں ہزاروں مزدور پادری گیپن (GAPON) کی قیادت میں زار کے محل کے سامنے جمع ہوتے اور اپنے ہاتھوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصاویر لئے یہ درخواست پیش کرنے کی کوشش کی کہ انہیں شہری آزادی دی جائے، معقول اجرت دی جائے۔ ایک عام اور مساویانہ انتخاب کے ذریعے ایک دستور ساز اسمبلی قائم کی جائے۔ لیکن درخواست کو منظور کرنا تو کجا اس کو پیش کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ اور نہتے مزدوروں پر گولیاں چلائی گئیں جس کے نتیجے میں ایک ہزار سے زائد مزدور ہلاک ہوئے اور دو ہزار سے زائد زخمی ہوئے[۴]

---

۱ Mission to Turkestan OP Cit. P.P. 49.50

۲ ماہنامہ ترجمان کراچی جنوری ۱۹۵۱ء مقالہ ترکستان روس کے پنجۂ استبداد میں از اعظم ہاشمی ترکستانی

۳ Mission to Turkestan OP Cit. P. 142. ۴ Lenin Selected Works Vol, 1. P. 788

روسیّت کا دیوتا

روسی سلطنت میں روسیّت کا دیوتا پُج رہا تھا۔ یہاں کے باشندے روسی اور غیر روسی کے دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اولاً تو فقط شاہی خاندان کو تمامتر تقدسات اور ترجیحات حاصل تھیں اور اس سلسلے میں کوئی بھی اس کا شریک وسہیم نہ تھا لیکن بعد میں پوری روسی قومیّت کو اس اعزاز سے نوازا گیا۔ اور اس کو غیر روسیوں کے مقابلے میں خاصے امتیازات حاصل ہوتے۔ اولیا آتا کے گورنر، جنرل سامونوف نے ایک مرتبہ اپنے اہل کاروں کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا

"روسی کسان اور مزدور خواہ وہ چور اور ڈاکو ہی کیوں نہ ہو۔ شریف اور معزز ترک شہری کے مقابلے میں زیادہ عزّت کا مستحق ہے۔ اور زیادہ حقوق رکھتا ہے"[1]

اس شخص نے اپنی اور زار کی تصویر اولیا آتا کی جامع مسجد میں آویزاں کر رکھی تھی۔ ایک اور گورنر جنرل مارٹنس نے فرمان جاری کیا کہ جب کوئی افسر خواہ وہ کسی مرتبے اور عہدے کا ہو، راستے سے گزرے تو ہر ترکستانی اپنی جگہ پر نگاہیں نیچی اور گردن خم کر کے دست بستہ کھڑا ہو جائے۔ اسی گورنر جنرل نے یہ حکم بھی نافذ کیا کہ کوئی ترکستانی کسی پارک میں داخل نہیں ہو سکتا۔ جنرل کروپٹکن (Kruptkin) ترکستان میں زارشاہی کا آخری گورنر جنرل تھا۔ اس نے ظلم کی انتہا کر دی۔ شمال مشرقی ترکستان کے کرغیز اور قازق کی رہی سہی زمینیں زبردستی چھین کر روسیوں کو دے دیں اور جب ترکوں نے پُرامن احتجاجی مظاہرہ کیا تو اس نے مظاہرین کے قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ اس قتلِ عام میں تقریباً ۱۵ ہزار ترک مارے گئے[2]

مغربی ترکستان میں روسی زاروں کا دورِ استبداد ۴۲ سال پر محیط تھا۔ اس عرصے میں پندرہ بغاوتیں بڑے وسیع پیمانے پر ہوئیں۔ یہی کیفیت ایدل اورال، داغستان اور کریمیا کی تھی۔ روسی سامراج اپنے لاؤ لشکر اور ہتھیاروں کی قوت سے اگرچہ ہر بغاوت کو کچلنے میں کامیاب رہا مگر دلوں کی آگ سرد نہ ہو سکی اور خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح دوبارہ بھڑک اٹھنے کے لئے موقع کی منتظر رہی۔

انیسویں صدی کے آخر میں روسیانے کی پالیسی پر عمل شروع کیا گیا۔ اس پالیسی کا محور و مرکز یہ تصوّر تھا کہ زار کی دوسری رعایا کے مقابلے میں روسی افضل و برتر ہیں اور زار کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ روسیوں کو دوسرے

---

[1] ماہنامہ "ترجمان" کراچی جنوری ۱۹۵۱ء۔ مقالہ "ترکستان روس کے پنجہ استبداد میں" از اعظم ہاشمی ترکستانی

[2]

لوگوں پر ترجیح دے۔ ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے بعد کچھ عرصے تک تمام غیر روسی اقوام کو نسبتاً زیادہ آزادی حاصل رہی۔ لیکن ۱۹۰۷ء کے بعد روسیانے کی مہم دوبارہ زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی۔ اس دفعہ وزیر اعظم پی اے سٹول پن اس تحریک کا روحِ رواں تھا۔ اس نے جو نیم آمرانہ اور نیم دستوری نظام وضع کیا اس کا اساسی و بنیادی نظریہ یہی روسیّت تھی[1]

روسیّت یا روسی قوم پرستی کا جنون سب سے زیادہ یوکرین، سفید روس، لیتھونیا، بسرابیا اور پولینڈ میں یہودیوں کے خلاف کار فرما نظر آیا، مزدوروں، محنت کشوں، کسانوں اور نچلے متوسط طبقہ کے جن ہجوموں نے یہودیوں کو قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا نشانہ بنایا ان میں اتنے روسی نہیں تھے جتنے کہ مذکورہ علاقوں کے مقامی باشندے۔ اصل میں یہ ہنگامے اور قتل و غارت گری روسی قوم پرستی کا مظہر نہیں تھے بلکہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مخالف طبقوں کے جذبات کا رخ یہودی سرمایہ داروں کی جانب موڑ دیا گیا تھا۔ یہودی سرمایہ داری اور تموّل کی علامت تھے۔ لوگوں کو یہ تاثر دیا گیا کہ وہ محض یہودیوں کے استحصالی ہتھکنڈوں کا نشانہ بننے کی وجہ سے غربت و افلاس کا شکار ہیں۔ چنانچہ سماجی انقلاب کی عوامی خواہش نے یہودیوں سے نفرت کا روپ دھار لیا۔ وہ یہودیوں کو تباہ کرنے لگے۔ اور محکوم قومیتوں کا روسی حکمرانوں کے خلاف سارا غصہ یہودیوں پر نکلنے لگا۔ یہودی قربانی کا بکرا بنے اور روسی سرمایہ دار عوامی غیظ و غضب سے محفوظ رہا۔ یہی وجہ تھی کہ روسی پولیس نے یہودیوں کے خلاف ہنگاموں کی حوصلہ افزائی کی۔ اسی طرح باکو کے شہر میں فسادات برپا کرائے گئے۔ باکو میں کئی قومیتیں آباد تھیں۔ یہاں یہودیوں کی بجائے آرمینیائی سرمایہ داروں کو غریب اور پسماندہ آزری ترکوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بننا پڑا۔ اس ترقی پذیر شہر میں آزری ترک مزدوروں اور محنت کشوں کی اکثریت تھی روسی شہنشاہیت کے آخری برسوں میں ٹرانس کاکیشیا کے علاقے میں آزریوں کے ہاتھوں آرمینیائی باشندوں کی غارت گری اور آرمینیائی باشندوں کے آزری ترکوں پر حملے آئے دن کا معمول بن گیا تھا۔ اور روسی حکام اسے ناپسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے[2]

معاشی استحصال ۔ روس میں اقتصادی لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری تھی جس سے معیشت

---

[1] از ہیوگ سٹین واٹسن ص ۳۳، ۳۴ [2] ایضاً

روس کی اکثر زرعی فصلیں اور معدنی وسائل غیر روسی علاقوں سے حاصل کی جاتی تھیں۔ مثلاً روس کی غلہ کی پیداوار کا بیشتر حصہ ان علاقوں میں پیدا ہوتا تھا جن کی آبادی یوکرینی اور تاتاری تھی۔ غلہ اگانے والی زرخیز اراضیات والگا، کریمیا اور یوکرین میں تھیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں روسی سلطنت میں کپاس خاصی مقدار میں پیدا ہونے لگی۔ اور اس کی وجہ وسطی ایشیا کے وہ زرخیز علاقے تھے جن پر روس نے قبضہ کر لیا تھا۔ روس کی ایک اور اہم فصل چقندر تھی جس پر قند سازی کی صنعت کا انحصار تھا۔ چقندر اگرچہ کیف کے مغربی علاقے میں پیدا ہوتا تھا لیکن اس کی کاشت بھی روسی نہیں بلکہ یوکرینی کاشتکاروں کی رہین منت تھی[1]

اسی طرح اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورال کی کانوں سے لوہا نکلنا شروع ہوا اور روس لوہے کا سب سے بڑا برآمدی تاجر بن گیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں یورال کے لوہے کی جگہ روسی پولینڈ اور یوکرین نے لی۔ مشرقی یوکرین کا علاقہ کوئلے کی سپلائی کا سب سے بڑا ذریعہ بنا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جزیرہ نما باکو سے وسیع پیمانے پر تیل نکلنا شروع ہوا جہاں زیادہ تر آذری ترک آباد تھے[2]

لیکن اس کے برعکس انیسویں صدی کے آخر تک جتنے بھی کارخانے لگائے گئے ان میں سے بیشتر روسی آبادی والے علاقوں میں تھے۔ ان میں سینٹ پیٹرزبرگ، ماسکو اور وسطی روس کے علاقے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس نامعقول اور بے جوڑ تکنیک نے معیشت کے اندر کافی ناہمواریاں اور نشیب و فراز پیدا کر دیئے[3]

صدائے بازگشت

زار شاہی روس کے اس استبدادی دور میں لوگوں کا بے چین ہو جانا اور زیر زمین سرگرمیوں میں مصروف ہو جانا ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ مختلف لہجوں میں اس اضطراب کی صدائے بازگشت سنائی دی جانے لگی۔ ۱۹۰۵ء میں زار شاہی کے خلاف روسی عوام اور بحری افواج میں بغاوت ہو گئی۔ انقلاب کی اس کوشش ناکام کے بعد زارِ روس نے عوام اور فوج کو مطمئن کرنے کے لئے متعدد اقدامات کئے نیا دستور نافذ کیا۔ سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی اور انتخابات کروانے

Mission to Turkestan OP Cit. P. 27,

کا اعتدال و توازن ناقابلِ اصلاح حد تک بگڑ گیا تھا۔ ایشیائی مقبوضات میں روسی اور مقبوضہ یورپی علاقوں کے نوآبادکاروں کو حکومت کی سرپرستی میں لا بسانے کی کوشش کی گئی۔ اس سے سائبیریا، ایدل اور ال اور کریمیا میں تاتاری مسلمان جو کبھی غالب اکثریت میں ہوا کرتے تھے اقلیت میں تبدیل ہو گئے۔ اس کے بعد باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ نوآبادکاروں کے اس سیلاب کا رُخ قازق اور ترکستان کی جانب پھیرا گیا۔ کوہستان اورال سے فرغانہ کی سرسبز وادیوں تک روسیوں اور غیر روسی یورپین کے گاؤں آباد ہو گئے۔ یہ نوآبادکار جہاں بھی گئے زرخیز زمینیں مسلمان مالکوں سے چھین کر انہیں دی گئیں۔ سینٹ پیٹرز برگ (دارالحکومت) سے احکام جاری کر دیئے گئے تھے کہ "آبادکاروں کے لئے زمین مہیا کرو"۔ ان احکام کی تعمیل میں حکام اپنی صوابدید کے مطابق منصوبے بناتے۔ آبادکار خود بھی گوناگوں ہتھکنڈے استعمال کرتے۔ یہ آبادکار ایک مصیبت تھے۔ روسی پہلے معمولی کرایہ پر زمین لیتے اور پھر اس پر قبضہ کر لیتے۔ ترکستان میں جو لوگ آباد کئے گئے وہ کسان تھے نہ مزدور۔ بلکہ وہ لوگ تھے جو روس میں مختلف حالات کی بنا پر مفلس و قلاش ہو چکے تھے۔ روسی حکومت انہیں طرح طرح کے جُل اور فریب دے کر ترکِ وطن پر آمادہ کرتی، شاندار مستقبل کے سپنے دکھاتی، کہتی تمہیں وہاں سونے کے پہاڑ ملیں گے[1]

ان آبادکاروں نے زرخیز الاضی ہی پر نہیں ریشم کی صنعت اور معدنیات کی کانوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ ان نوآبادیات کو گوناگوں ہتھکنڈوں سے لوٹتے تھے۔ سامراجی افسروں کی بڑی بڑی تنخواہیں تھیں، خصوصی مراعات ان کے علاوہ تھیں۔ گورنروں سے لے کر عام فوجی تک جی بھر کر ہاتھ رنگتے اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا کوئی کام رشوت کے بغیر انجام نہ پاتا۔ ترکوں سے بیگار لی جاتی اور ان کی اجرت روسی خود ہضم کر جاتے۔ رشوت خوری اور بدعنوانیاں عام تھیں۔ اس لوٹ کھسوٹ کا نتیجہ یہ تھا کہ روسی دیہات اور قصبات میں خوشحالی کا دور دورہ تھا جو لوگ اپنے وطن میں غربت و افلاس کی چکی میں پسا کرتے تھے انہیں مسلمان علاقوں میں آباد ہوئے زیادہ زمانہ نہ گزرتا کہ عیش و عشرت کی بساط بچھا لیتے۔ ملک کی زرعی و معدنی دولت بے تحاشا روس منتقل کی جانے لگی۔ زرخیز زمینیں بڑے بڑے کاروبار اور صنعتیں چھن جانے سے مقامی باشندے معاشی بدحالی کی پستیوں میں ڈوب کر رہ گئے[2]

[1] Mission to Turkestan OP Cit. P. 183, 191, 19

[2] Mission to Turkestan OP Cit. P. 142, 143

مختلف گروہ اور سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں۔ رسائل و جرائد شائع ہوئے۔ اگست ۱۹۰۵ء میں "اتفاق المسلمین" کے نام سے ایک جماعت وجود میں آگئی جس کا مقصد روس کے تمام ترک مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا۔ یہ جماعت تورانیت (Pan Turkism) کی علمبردار تھی تاہم اس کا سیاسی نصب العین مذہبی آزادی کی جدوجہد قانون کی نظر میں تمام شہریوں کی مساوات اور قومی تہذیب و ثقافت کی ترقی کے لئے قانون سازی تھا۔ اس کے متوازی دائیں بازو کی جماعت "صراطِ مستقیم" وجود میں آئی۔ مسلمان اقوام میں سیاسی زندگی اور اپنے حقوق کے تحفظ کا جوش و جذبہ روسیوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ چنانچہ زار نکولس دوم نے ۱۹۰۷ء میں انتخابی قوانین بدل ڈالے۔ ۱۹۰۸ء میں اس سیاسی زندگی کی بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی۔ جو ۱۹۰۵ء کے ناکام انقلاب کا ردِ عمل تھی۔ تمام تحریکیں اور جماعتیں زیرِ زمین چلی گئیں اس کا فائدہ انقلابی گروہوں نے سمیٹا۔

اتفاق المسلمین کے لیڈروں نے مختصر سی سیاسی آزادی کے دور میں اپنے مطالبات منوانے کی آئینی کوشش کی مگر روسی حکومت نے انہیں سخت مایوس کیا۔ انجام کار ترک نوجوان انقلابی جماعتوں سے وابستہ ہو گئے۔ آزاد سیاسی زندگی ختم ہونے کے بعد قازان میں "حریت" اور آذربائیجان میں "مساوات" نامی خفیہ جماعتیں قائم ہو گئیں۔ انتہا پسندوں نے تاتاری سوشلسٹ انقلابی گروپ بنایا۔ مساوات سے تعلق رکھنے والے بائیں بازو کے افراد نے ہمت کے نام سے جماعت بنائی۔ بعد ازاں یہی لوگ سوشلسٹ ڈیموکریٹس کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ جس نے آگے چل کر بالشویک گروپ کی شکل اختیار کر لی۔[۵]

چنانچہ اس زمانے کی دوسری تحریکوں کی طرح سائنٹیفک سوشلزم (مارکسیت) کی اس تحریک کو بھی اپنے وجود و ارتقاء کے ہر مرحلے پر زار شاہی استبداد کا سامنا کرنا پڑا۔

مارکسزم کی انقلابی جدوجہد

لینن کا کارنامہ

اسی زمانہ میں لینن منظرِ عام پر آیا۔ وہ ۱۸۷۰ء میں سمبرسک کے مقام پر پیدا ہوا۔ ۱۸۸۷ء میں اس نے جامعہ قازان میں شرکت کی۔ لیکن طالب علموں

---

[۵] روس میں مسلمان قومیں ص ۶۹، ۷۰

…لی تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے بہت جلد اسے جامعہ سے خارج کر دیا گیا۔ ۱۸۹۳ء میں لینن سینٹ پیٹرز…گیا۔ وہاں کے مارکسی حلقے اس کی بحث و گفتگو سے بہت متاثر ہوتے۔ اپنی تنظیمی اور علمی قابلیت کے …لینن اس مقام کے مارکسیوں کا رہنما بن گیا۔ ۱۸۹۵ء میں اس نے تمام مارکسی کارکنوں کو ایک مجلس میں مجتمع …کر دیا جس کا نام "طبقۂ عمال کی نجات و خلاصی کے لئے جدوجہد کرنے والی مجلس" (League of Struggle for the Emanipation of Working Cla…) تھا۔ لینن نے اس مجلس کے …کام کیا کہ وہ طبقۂ عمال سے زیادہ قریبی روابط قائم کرے۔ اور سیاسیات میں ان کی رہنمائی کا کام سر انجام … ابھی تک مارکسی اصولوں کی تبلیغ و اشاعت مزدوروں اور عمال کے اس طبقے تک محدود تھی جو …ی اور علمی لحاظ سے بیدار تھا۔ لینن کا یہ ایک عظیم کارنامہ تھا کہ اس نے تمام مزدوروں میں اس تحریک کو …شروع کیا۔ لینن کی رہنمائی میں مجلس جدوجہد نے اپنے معاشی مطالبات کے علاوہ حکومت کے خلاف سیاسی …جہد کا بھی آغاز کیا۔ ۱۸۹۵ء میں حکومتِ زار نے لینن کی سیاسی سرگرمیوں سے خوفزدہ ہو کر اسے گرفتار کر لیا۔ لیکن وہ …ل میں بھی اپنا کام کرتا رہا۔ سینٹ پیٹرزبرگ کی مجلس جدوجہد نے دوسرے شہروں کے مزدوروں میں بھی اتحاد و …ل کا جوش پیدا کر دیا۔ چنانچہ ان شہروں میں بھی مماثل مجالس کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۹۴ء میں ماسکو میں مزدوروں کی انجمن …ی۔ ۱۸۹۰ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیانی سالوں میں قاف کے علاقوں میں بھی مارکسی تنظیمیں قائم ہونے لگیں۔ ۱۹۰۰ء کے …سائبیریا میں معاشرتی جمہوری انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح سے روس کے تمام بڑے بڑے شہروں میں مارکسی …اشرتی جمہوری تحریک پھیلنے لگی۔[۱]

…پہلی کانگریس کا انعقاد

اس تحریک نے مغربی روس میں ترقی کا ایک اور قدم آگے بڑھایا۔ پولینڈ کی قوم پرست جماعت سے وہ تمام عناصر علیحدہ ہو گئے جو مارکسی نظریات کے حامی تھے …انہوں نے لتھوانیا اور پولینڈ کی معاشرتی جمہوری پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح لیٹویا میں بھی معاشرتی جمہوری …ظیمات قائم ہوئیں۔ ۱۸۹۷ء میں صیہونی (یہودی) معاشرتی جمہوری پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جسے بنڈ کہا …جاتا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں سینٹ پیٹرزبرگ ماسکو اور کیف کی مجالس جدوجہد نے بنڈ کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی کوشش …کا آغاز کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ تمام جماعتیں اپنی انفرادی حیثیت چھوڑ کر ایک واحد معاشرتی جمہوری پارٹی

---

[۱] …اشتراکیت اور نظام اسلام ص ۸۰، ۸۱

کی شکل اختیار کرلیں۔ چنانچہ اس غرض سے انہوں نے روس کی معاشرتی جمہوری جماعتوں کی ایک کانگریس [illegible] کی۔ جو مارچ ۱۸۹۸ء میں بمقام منسک (MINSK) منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں صرف نو اشخاص [illegible] ہوئے۔ لینن بھی قید میں ہونے کی وجہ سے شرکت نہ کرسکا۔ حکومت نے مجوزہ معاشرتی پارٹی کی مرکزی [illegible] کو فوراً گرفتار کرلیا۔ اس کے باوجود کانگریس نے روس کی معاشرتی جمہوری مزدور پارٹی کے باقاعدہ قیام [illegible] اور ایک منشور جاری کیا۔ یہ اعلان محض لفظی تھا کیونکہ کانگریس مختلف مارکسی حلقوں کو یکجا اور متحد کرنے میں [illegible] رہی۔ ملک کی مختلف مقامی تنظیمات اب تک کسی مشترک پالیسی یا طریق کار پر کاربند نہ تھیں نہ پارٹی کا کوئی [illegible] پروگرام مقاصد قواعد وضوابط مرتب کئے گئے تھے۔ اور نہ ہی کوئی مرکز وجود میں آیا تھا۔ ان حالات میں ایک فکری [illegible] کا پیدا ہوجانا ایک قدرتی بات تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں کی تحریک میں بے اصول اور مصلحت پسند [illegible] داخل ہونے لگے۔[1]

اسکارا اور دوسری کانگریس

لینن نے سائبیریا کی قید ہی میں اپنی مشہور کتاب (Development of Capitialism) تصنیف [illegible]

اسی زمانے میں اس نے معاشیین (Economists) کے رویہ پر توجہ دی کیونکہ اس کو اندیشہ تھا [illegible] مزدوروں کی تحریک معاشیین کے افکار سے متاثر ہوگئی تو انقلاب کے امکانات ختم ہوجائیں گے۔ یہ گروہ لینن [illegible] کے قید کے زمانے میں سینٹ پیٹرزبرگ کے مجلس جدوجہد ہی کے اندر سے نمودار ہوا اور کہتا تھا کہ مزدوروں [illegible] صرف اپنے آجروں کے مقابلے میں معاشی جدوجہد کرنی چاہئے۔ اور سیاسی جدوجہد کا میدان جمہوریت پسندوں [illegible] اعتدال پسند عناصر کے لئے چھوڑ دینا چاہئے۔

قید سے رہائی کے بعد لینن نے ایک اخبار نکالنے کا ارادہ کیا تاکہ اس کے ذریعے وہ مارکسیت کے صحیح [illegible] فکر کو پیش کرکے اس پراگندہ خیالی کو دور کردے۔ جس میں مارکسیوں کے مختلف حلقے مبتلا تھے۔ یہ کام اس [illegible] ضروری تھا کہ فکری اتحاد کے مختلف مارکسی تنظیمات کو ایک متحدہ جماعت کی شکل نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس [illegible] اندازہ ہوتا ہے کہ لینن ہی مارکس کا اصل جانشین اور مارکسزم کی انقلابی جدوجہد کا روح رواں تھا۔ اس [illegible] علاوہ مارکسیت کی نام لیوا تمام جماعتیں مارکس کی مجوزہ انقلابی راستے سے ہٹی ہوئی تھیں۔ لینن ان سب [illegible]

---

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام ص ۸۱، ۸۲

[illegible] مارکسیت کی ایک لڑی میں پرو دینا چاہتا تھا۔ روس میں آزادیِ تحریر وتقریر پر جو پابندیاں تھیں ان کی وجہ سے مجوزہ [illegible] کی اشاعت اس ملک میں ممکن نہ تھی۔ اس لئے لینن نے اپنا اخبار "اسکارا" بیرون ملک سے شائع کرنا شروع [illegible] دسمبر ۱۹۰۰ء میں اس اخبار کا پہلا پرچہ منظرِ عام پر آیا۔[1]

لینن نے اپنے اخبار اسکارا میں مزدوروں کی ایک پارٹی کی تشکیل پر بہت زور دیا۔ بالخصوص اس نے اپنی کتاب (What is to be Done) میں نہایت مدلل طریقے سے پارٹی کی ضرورت کو ثابت کیا۔ مجوزہ پارٹی کا پروگرام [illegible] کیا۔ اور مزدوروں کی جدوجہد کا آخری مقصد واضح کیا۔ لینن کی تبلیغی جدوجہد بے اثر نہیں رہی۔ ۱۹۰۳ء میں [illegible] معاشرتی جمہوری پارٹی کی دوسری کانگریس بمقام برسیلز اور پھر لندن میں منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں کل ۴۳ [illegible] شریک تھے۔ جو ۲۶ مختلف تنظیمات کے نمائندے تھے۔ ان میں سے ۳۳ مندوبین اسکارا کے پیش کردہ پروگرام [illegible] متفق تھے۔ لیکن بقیہ مندوبین اس سے اختلاف رکھتے تھے۔ دو مسائل خاص طور پر مختلف فیہ تھے۔ اولاً [illegible] آمریت کا قیام۔ دوم روس کے مختلف اقوام کے حق خودارادیت کا مسئلہ۔ پہلے مسئلے کے متعلق ایک گروہ کا خیال [illegible] چونکہ دوسرے ممالک کی معاشرتی جمہوری پارٹیوں نے اسے اپنے پروگرام کا جزء نہیں بنایا ہے اس لئے مجوزہ روسی [illegible] کو بھی اس بارے میں سکوت اختیار کرنا چاہئے۔ دوسرے مسئلے کے بارے میں بھی ایک گروہ کا خیال یہی تھا [illegible] اس مسئلے کو چھیڑنا ٹھیک نہیں۔ بالآخر کانگریس نے اسکارا کا تجویز کردہ پروگرام منظور کرلیا۔ جس کے دو اجزا [illegible] ایک جز فوری مقاصد سے متعلق تھا اور ایک آخری مقصد سے تعلق رکھتا تھا۔ فوری مقاصد میں یہ امور شامل تھے [illegible] زار کا خاتمہ۔ جمہوری حکومت کا قیام۔ آٹھ گھنٹوں کا دن اور غلامی کی رسومات کا استیصال۔ آخری مقصد [illegible] اشتراکی انقلاب برپا کرکے سرمایہ داری کا خاتمہ کردیا جائے۔ اور ملک میں پرولتاری آمریت قائم ہوجائے۔[2]

[illegible] کشمکش کا آغاز

کانگریس کے مندوبین میں اس بات پر بھی اختلاف تھا کہ پارٹی کو کن اصولوں پر منظم کیا جائے۔ لینن اور اس کے ہم خیال مندوبین کی رائے یہ [illegible] پارٹی میں شرکت کے قواعد سخت ہونے چاہئیں اور اس میں صرف پارٹی کے مرتبہ پروگرام پر سختی سے کاربند [illegible] کو شریک کیا جانا چاہئے۔ ایسے لوگ جو پارٹی کی مالی اعانت بھی کرتے ہوں۔ اور اس کی مختلف مجالس میں عملی [illegible] شرکت بھی کرتے ہوں۔ مارٹوو (MARTOO) اور اس کے دو ساتھی اس خیال کے حامی تھے کہ یہ ضروری نہیں

---

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام ص ۸۲، ۸۳
[2] " " " " ۸۴، ۸۶

نہیں کہ پارٹی کے تمام اراکین لازمی طور پر اس کی تمام مجلسوں کے عملی پروگراموں میں شریک ہوں۔ اس اختلاف کے [illegible] کانگریس میں لینن اور اس کے ہم خیالوں کو غالب اکثریت کی تائید حاصل تھی۔ اس لئے ان لوگوں کو بالشویک کہا [illegible] لگا جس کے معنی اکثریت کے ہیں اور دوسرے فریق کو منشویک یعنی اقلیت کے نام سے موسوم کیا گیا۔ د[illegible] کانگریس کے بعد بالشویکوں اور منشویکوں کی کشمکش میں اور زیادہ شدت پیدا ہوگئی۔[1]

بالشویکوں اور منشویکوں کے درمیان اسکارا کی مجلس ادارت میں اکثریت اور غلبہ حاصل کرنے کی کوشش [illegible] ہوگئیں۔ اول تو منشویکوں کے تمام ارکان کو اس سے نکال دیا گیا۔ لیکن بعد میں منشویک پھر مجلس ادارت پر [illegible] اور اسکارا انہی کا ترجمان بن گیا۔ ۱۹۰۴ء میں دو غدار بالشویکوں کی مدد سے منشویکوں نے پارٹی کی مرکزی [illegible] میں بھی غلبہ حاصل کرلیا۔ اخبار اور مرکزی کمیٹی میں مغلوب ہو جانے کے بعد بالشویکوں کی حالت بہت خراب [illegible] اس لئے انہوں نے ایک الگ اخبار اور نئی مرکزی کمیٹی تشکیل دینے کی ضرورت محسوس کی جس کے لئے انہوں [illegible] کی تیسری کانگریس منعقد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔[2]

۱۹۰۵ء کا انقلاب اور تیسری کانگریس

اسی اثنا میں روس اور جاپان کی جنگ شروع ہو[illegible] میں روس کو کئی شکستیں اٹھانی پڑیں۔ ان ش[illegible] حکومت کو عوام کی نظر میں بے وقعت کر دیا۔ اور انہیں محسوس ہوا کہ زار کی حکومت اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے [illegible] دوران بالشویکوں کی سرکردگی میں پہلے باکو اور پھر سینٹ پیٹرزبرگ کے کارخانوں میں مزدوروں نے ہڑتالیں کر[illegible] پھر یہ سلسلہ تمام شہروں تک متعدی ہوگیا۔ مزدوروں نے زار نکولاس کی سرمائی محل کے سامنے جمع ہو کر نہایت [illegible] اور عاجزی سے اپنے مطالبات پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حکومت نے ان پر بے تحاشا گولیاں چلائیں جس [illegible] بے شمار مزدور ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ یہ خبر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح بہت جلد پھیل گئی۔ حکومت [illegible] سفاکی کے رد عمل میں ہر جگہ ہڑتالیں شروع ہوگئیں۔ پھر شہروں سے نکل کر یہ شورش دیہاتوں میں بھی پھیل [illegible] کسان زمینداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ان کی زمینوں پر قبضہ کرلیا۔ اور ان کے محلات میں آگ لگا د[illegible] فوجیوں اور ملاحوں نے بھی بغاوت کر دی۔ روسی حکومت نے بغاوت کو فوجی طاقت سے کچل دیا لیکن ا[illegible] حکمت عملی پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ عوام سے وعدہ کیا کہ ایک نیابتی مجلس ڈ[illegible]

---

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام ص ۸۴، ۸۵ [2] ایضاً ۸۵، ۸۶

[illegible] جائے گی جس میں عوام کے نمائندوں کو صلاح مشورے کی غرض سے شریک کیا جائے گا تاہم ڈیوما کو قانون سازی کا [illegible] حاصل نہیں ہوگا۔ بالشویکوں نے اس ڈیوما کے مقاطعے کا اعلان کر دیا۔ لیکن منشویکوں نے طے کیا کہ وہ ڈیوما میں [illegible] ہوں گے۔[1]

روس کی معاشرتی جمہوری پارٹی اگرچہ اس وقت تک صورتاً ایک دکھائی دیتی تھی لیکن شدید اختلافات کی [illegible] وہ درحقیقت بالشویک اور منشویک دو گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جن کے پریس اور مرکز جدا جدا تھے۔ [illegible] نے تیسری کانگریس منعقد کرنے کا اعلان کیا تو منشویکوں نے الگ کانگریس منعقد کرنے کا تصفیہ کیا۔ [illegible] ۱۹۰۵ء میں بمقام لندن پارٹی کی تیسری کانگریس منعقد ہوئی۔ منشویکوں نے اپنی کانگریس جنیوا میں منعقد کی۔[2]

[illegible] نظر کا اختلاف

دونوں کانگریسوں میں تقریباً یکساں مسائل زیر بحث تھے یعنی انقلاب برپا کرنے کی تدابیر اور طریق کار۔ بالشویکوں کی کانگریس اس نتیجے پر [illegible] کہ باوجودیکہ ۱۹۰۵ء کی انقلابی جدوجہد درمیانی طبقہ کی جدوجہد ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری [illegible] علیٰ حالہ باقی رکھتے ہوئے اس میں چند سیاسی اور معاشی حقوق حاصل کئے جائیں۔ لیکن پرولتاری طبقہ اس انقلاب کی [illegible] سے بہت زیادہ تعلق خاطر رکھتا ہے کیونکہ اس کی کامیابی ہی سے وہ سیاسی، مدنی اور معاشی حقوق حاصل [illegible] گے۔ جن سے فائدہ اٹھا کر پرولتاریہ اپنی تنظیم مستحکم کرے گا۔ اور سیاسی جدوجہد کے طریقوں میں تجربہ حاصل کر [illegible] درمیانی اعتدال پسند طبقوں کے حاصل کردہ حقوق و مراعات سے ایک قدم بڑھ کر پرولتاری انقلاب برپا کرے [illegible] اس مقصد کے لئے پرولتاریہ یعنی مزدوروں کو کسانوں کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر [illegible] ایداروں کے ایک بڑے حصے یعنی زمینداروں کی طاقت کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ جمہوریت پسند درمیانی طبقات [illegible] اس مکمل پرولتاری انقلاب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ مزدوروں اور کسانوں کے مقابلے میں زار روس [illegible] سیادت کو ایک مخالف قوت کی حیثیت سے باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے اقتدار کو صرف آئینی شکل [illegible] چاہتے ہیں۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ جمہوریت پسند درمیانی طبقہ دستوری بادشاہت کی بنیاد پر زار روس [illegible] حکومت سے مصالحت کرے اور انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے روک دے۔ انقلاب کی تکمیل کے لئے ضروری [illegible] سیاسی تحریک کی رہنمائی پرولتاریہ کے ہاتھ میں ہو اور انہیں کسانوں کی ہمدردی اور تائید حاصل ہو نیز انقلاب

---

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام ص ۸۷، ۸۸ [2] ایضاً

کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرتی جمہوری پارٹی کسی ایسے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے جس میں اس کے انقلابی حکومت بنانے کا امکان موجود ہو۔ ؎

منشویکوں کا خیال تھا کہ ملک میں جو انقلاب واقع ہو رہا ہے وہ چونکہ درمیانی طبقوں کا انقلاب ہے اس کی رہنمائی بھی انہی طبقوں کو کرنی چاہئے اور پرولتاریہ کو اپنے ہاتھ میں رہنمائی لینے کی کوشش نہیں ... پرولتاریہ کو کسانوں کے ساتھ تعلقات قائم نہیں کرنے چاہئیں۔ بلکہ درمیانی اعتدال پسند طبقوں کے ساتھ ... کام کرنا چاہئے۔ جو اس وقت سیاسی تحریک کے رہنما ہیں۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اس وقت پرو... اپنے انقلابی انداز سے درمیانی طبقوں کو خوف زدہ نہ کرے کیونکہ اگر پرولتاریہ کی انتہا پسندی اور انقلا... طرز و انداز سے ڈر کر انہوں نے اپنی سیاسی جدوجہد کو ملتوی کر دیا۔ یا روس کی حکومت سے مصالحت کر... تو انقلاب کے مواقع کم ہو جائیں گے۔ انقلاب کی تکمیل کے لئے بہتر یہی ہو گا کہ کوئی نیابتی مجلس زمسکی سو... ڈیوما کی مانند قائم ہو جائے جس پر مزدور طبقہ باہر سے اپنا اثر ڈال سکے۔ ؎

مسلح بغاوت اور چوتھی کانگریس

۱۹۰۵ء کے موسم خزاں میں انقلابی تحریک پورے زور ... ستمبر میں ماسکو اور تمام دوسرے شہروں کے مطابع میں ... ہوئی۔ اکتوبر میں ریلوے کے مزدوروں نے ہڑتال شروع کی جس کی وجہ سے ریلوں اور تار گھروں کا کاروبار ... ہو گیا۔ اس کے بعد ہر طرف ہڑتالیں شروع ہو گئیں اور سارے ملک کا نظام تہہ و بالا ہو گیا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو زار روس نے خوف زدہ ہو کر ایک اعلان کے ذریعہ مدنی آزادیاں عطا کرنے کا وعدہ کیا۔ شخصی آزادی ضمیر و مذہب کی آزادی، تحریر و تقریر اور اجتماع کی آزادی کی پیشکش کی گئی۔ ایک قانون ساز ڈیو... انعقاد کا ارادہ بھی ظاہر کیا گیا۔ لیکن یہ بھی محض ایک دھوکا تھا۔ اور عوامی اضطراب کو ختم کرنے کی ایک ... بالشویکوں نے مزدوروں کو اس کے خلاف ابھارا۔ اور مسلح بغاوت پر اکسایا۔ اکتوبر کی عام ہڑتال ... زمانے میں ایک نئی قسم کی تنظیم کی بنا ڈالی گئی۔ جو بعد میں نائبین عمال سوویٹ (Soviet of Workers Deputies) کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ سوویٹ مختلف کارخانوں کے مزدوروں کے منتخب نمائندوں پر مشتمل تھی اور ان میں عام انقلابی عناصر جمع تھے۔ پہلے یہ سوویٹ سینٹ پیٹرزبرگ میں قائم ہو...

؎ اشتراکیت اور نظام اسلام صہ ۸۸، ۸۹

... ماسکو میں۔ دسمبر ۱۹۰۵ء میں سارے ملک میں سوویٹ قائم ہو گئے۔ اور یہ کوشش شروع ہوئی کہ فوجیوں ...وں کے بھی مماثل سوویٹ قائم کئے جائیں۔ اور پھر انہیں مزدوروں کے سوویٹوں سے متحد کیا جائے۔ ...یکوں نے مزدوروں اور کسانوں کو مسلح کرنے میں بڑی ہمت اور پامردی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے بیرونی ... سے خفیہ طور پر اسلحہ خرید کر کسانوں اور مزدوروں میں تقسیم کیا۔ نومبر ۱۹۰۵ء میں لینن جو ابھی تک ... سے باہر تھا واپس روس آیا۔ اسی زمانے میں سٹالن کوہ قاف کے علاقے میں انقلابی کام کر رہا تھا۔ لیکن ... دوسرے سے شخصی طور پر متعارف نہ تھے۔ دسمبر ۱۹۰۵ء میں فن لینڈ میں بالشویکوں کی ایک کانفرنس ...قد ہوئی۔ اس کانفرنس میں لینن اور سٹالن میں پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ اس عرصہ میں مزدوروں کی ایک ...لح بغاوت شروع ہو گئی۔ اس لئے لینن کے مشورے پر کانفرنس نے اپنا کام جلدی ختم کر دیا۔ اور لیڈر اپنے ... مقامات پر بغاوت کی رہنمائی کی غرض سے واپس چلے گئے۔

زار روس کی حکومت بھی غافل نہ تھی۔ جاپان سے صلح ہو جانے کے بعد زار کی حکومت کو سانس لینے کا موقع ...یا۔ اور اس نے انقلابی تحریک کو کچلنے کی پوری قوت صرف کر دی۔ لیکن زار نے صرف تشدد کے حربے پر ...وسہ نہیں کیا۔ بلکہ دسمبر ۱۹۰۵ء میں ایک قانون نافذ کیا جس کے لئے ایک نئی قانون ساز ڈیوما کے لئے ...خابات کرانے کا طریقہ معین کیا گیا۔ یہ انتخابی قانون بھی جمہوری طریقہ کے منافی تھا۔ کیونکہ اس میں ایسا ...ار طریق کار اختیار کیا گیا تھا کہ ڈیوما میں سرمایہ داروں اور زمینداروں کے نمائندوں کی اکثریت رہے۔ اسی ... دوران مزدوروں نے ایک دفعہ پھر محسوس کیا کہ ان کے درمیان مؤثر اتحاد کا فقدان ہے۔ چنانچہ پارٹی کی ...ایک چوتھی کانگریس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جو سویڈن میں اپریل ۱۹۰۶ء میں منعقد ہوئی۔ یہاں بھی بالشویکوں اور منشویکوں کے درمیان اختلافات ختم نہ ہو سکے۔ کانگریس کی منتخب کردہ مرکزی کمیٹی نے بہت جلد ہی اپنی مصلحت ...ستی کا ثبوت دیا اور یہ بات ظاہر ہو گئی کہ یہ کمیٹی عوام کی انقلابی تحریک چلانے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ ؎

...بناؤ بگاڑ اور سخت گیری

اس درمیان میں پہلی ڈیوما کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس ڈیوما کے منتخب نمائندے زار کی توقع کے برخلاف آزاد رائے رکھنے والے افراد تھے اور زار کی حکومت کے مطیع اور منقاد بن کر رہنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے زار نے اس ڈیوما کو معطل کر دیا۔ اور

؎ اشتراکیت اور نظام اسلام صہ ۹۰، ۹۱، ۹۲

سخت گیری کی پالیسی اختیار کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنی مرضی کے آدمیوں کو لانے کی خاطر زار نے دوسری ڈیوما منعقد کی لیکن پھر بھی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ اس لئے جون ۱۹۰۷ء کو دوسری ڈیوما بھی برخاست کی گئی اور بعد تیسری ڈیوما کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا۔ اور ساتھ ساتھ سخت گیری کی پالیسی بھی جاری رکھی۔ معاشرتی جمہوری پارٹی کے ۶۵ نائبین کو گرفتار کر کے سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ نیز زار کے وزیر استالی پن (Stolypin) نے مزدوروں اور کسانوں کے خلاف تشدد کی مہم کا آغاز کیا۔ ہزاروں انقلابی کارکنوں اور مزدور رہنماؤں کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اور بالشویکوں کی تمام تنظیمات کو درہم برہم کر دیا گیا۔ اس طرح پہلی انقلابی تحریک اپنے مقصد میں ناکام ہوئی اور وہ ایک عرصے تک حالات کی ناسازگاری کی بنا پر دبی رہی۔[1]

بالشویکوں کی جداگانہ پارٹی

تحریک کے دور تنزل میں منشویکوں کا انقلابی جذبہ بالکل سرد پڑ گیا اور انہوں نے سرمایہ داروں اور اعتدال پسند عناصر کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کرنا شروع کیا۔ بلکہ اس سے بھی گزر کر ایک اصلاح پسند پارٹی کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی۔ اس طرح انہوں نے انقلابی تحریک کے ساتھ عین وقت پر بے وفائی کی۔ بالشویکوں نے محسوس کیا کہ اگر اب بھی وہ اپنی الگ پارٹی نہیں بنائیں گے بلکہ منشویکوں کے ساتھ بدستور ایک پارٹی میں شریک رہیں گے تو انہیں منشویکوں کے اعمال و افعال اور منافقانہ روش کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ اس طرح پارٹی کی وحدت نے ان دونوں فریقوں کی مخالفت پر جو پردہ ڈال رکھا تھا اب چاک ہو گیا اور وہ ظاہری اتحاد ٹوٹ گیا۔ جو مخالفتوں کے باوجود اب تک ان کے درمیان قائم تھا۔ بالشویکوں نے قطعی ارادہ کر لیا کہ اب وہ منشویکوں سے باضابطہ علیحدہ ہو جائیں گے۔ اور ایک جداگانہ پارٹی قائم کریں گے۔ اس غرض سے انہوں نے پارٹی کی پانچویں کانگریس کے انعقاد کی تیاری شروع کی۔ جس کے سامنے سب سے اہم مسئلہ ایک جداگانہ پارٹی کی تنظیم کا تھا۔ بالشویک ایسی پارٹی بنانا چاہتے تھے جس میں مصالحت پسندوں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو اور جو درمیانی اعتدال پسند طبقات کی مخالف ہو۔ بالآخر روس کی معاشرتی جمہوری پارٹی کی پانچویں کانگریس ۱۹۱۲ء میں بمقام پراگ منعقد ہوئی اور اس نے منشویکوں کو پارٹی سے خارج کر دینے کا تصفیہ کر لیا۔ منشویکوں کے اخراج کے بعد بالشویک پارٹی

۱؎ اشتراکیت اور نظام اسلام ص ۹۳

ایک مستقل اور جداگانہ پارٹی کی حیثیت سے وجود میں آئی لیکن اس نے اپنا سابقہ نام (معاشرتی جمہوری پارٹی) قائم رکھا اور ۱۹۱۸ء تک وہ اسی نام سے یاد کی جاتی تھی۔ منشویکوں کے اخراج سے بالشویک پارٹی اور زیادہ قوی ہو گئی۔ کیونکہ اب اس میں مصلحت پسند عناصر باقی نہیں رہے۔[1]

نیا جوش نئے ولولے

۱۹۱۲ء میں سائبیریا میں لینا کے مقام پر سونے کی کان میں کام کرنے والے ۵۰۰ مزدوروں کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ اس واقعہ کا اثر یہ ہوا کہ سینٹ پیٹرز برگ، ماسکو اور دوسرے صنعتی شہروں میں مزدوروں نے لینا کے مقتولین کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے ہڑتالیں شروع کر دیں۔ اور ہڑتالیوں کی تعداد تقریباً ۳ لاکھ ہو گئی۔ مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تحریکات اور اجتماعی ہڑتالوں نے کسانوں کو بھی حرکت دی اور انہوں نے بھی اس کشمکش میں حصہ لینا شروع کیا۔ بالشویک پروپیگنڈے کے اثر سے کسان پھر زمینداروں کے خلاف آمادہ بغاوت ہونے لگے۔ انہوں نے زمینداروں کے محلات اور مالدار کسانوں کے کھیتوں کو جلانا اور برباد کرنا شروع کیا۔ ۱۹۱۳ء میں ترکستانی افواج نے ایک مسلح بغاوت کر دی۔ سیبسٹوپول اور بحیرہ بالٹک کے بیڑے میں بھی باغیانہ تحریکات رونما ہوئیں۔[1]

۱۹۱۲ء کے موسم گرما میں لینن نے پیرس سے گلیشیا کو نقل مکانی کیا تاکہ وہ روس سے نزدیک تر ہو جائے اسی زمانے میں بالشویکوں نے جمہوریہ پر اپنا اثر بڑھانے اور مزدوروں میں نیا جوش اور نئے ولولے پیدا کرنے کے لئے روزنامہ "پراودا" جاری کیا جس کے لفظی معنی سچائی کے ہیں۔ اس اخبار کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا۔ پراودا نے بالشویکوں کی انقلابی جدوجہد میں بڑا حصہ لیا۔ اور عوام کی تائید حاصل کرنے میں بڑی خدمات انجام دیں۔ حکومت نے اس کی اشاعت روکنے کی ہر کوشش کی۔ لیکن جرمانوں اور ضبطیوں کے باوجود اس اخبار نے اپنا کام جاری رکھا۔[3]

چوتھی ڈیوما اور بالشویکوں کی شمولیت

تیسری ڈیوما کے انعقاد اور بے اثر ہونے کے بعد ۱۹۱۲ء میں حکومت نے چوتھی ڈیوما کے لئے انتخابات منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ بالشویکوں نے انتخابات میں حصہ لینے کا تصفیہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے اس انتخاب میں منشویکوں کے تعاون کے بغیر خود مختارانہ طور پر کام کیا اور اپنے انتخابی اعلانات میں حکومت کے حامیوں اور درمیانی

۱؎ اشتراکیت اور نظام اسلام

اعتدال پسند عناصر دونوں کو یکساں ہدفِ تنقید بنایا۔ کامل جمہوریت کا قیام، آٹھ گھنٹے کا دن۔ زمینداروں کی بڑی بڑی جائدادوں اور جاگیروں کی ضبطی کے مطالبات ان کے انتخابی نعرے تھے۔ ڈیوما کے انعقاد کے بعد اس کی بالشویکی نمائندوں نے ڈیوما کے اجلاس میں زار کی استبدادی حکومت پر اعلانیہ تنقیدیں کیں۔ اور اس کے مجرمانہ افعال و حرکات کی پردہ دری کی۔ بالشویکوں نے مزدوروں کے لئے آٹھ گھنٹے کا دن مقرر کرنے کے لئے ڈیوما میں ایک مسودہ قانون بھی پیش کیا۔ اگرچہ یہ مسودہ نامنظور رہا۔ مگر اس کی وجہ سے بالشویکوں کی مقبولیت بڑھ گئی۔ ڈیوما کی بالشویکی جماعت نے اپنی مرکزی کمیٹی سے گہرا ربط قائم رکھا۔ اور اس کی رہنمائی میں اپنی آئینی جدوجہد جاری رکھی یہ زمانہ بالشویک پارٹی کا دورِ عروج تھا جس میں پارٹی نے خلافِ قانون تنظیمات قائم کیں۔ اور مزدوروں میں خفیہ طور پر انقلابی کام کیا۔ اگرچہ ڈیوما میں منشویکوں کے سات نمائندے تھے۔ اور اس کے مقابلے میں بالشویکی نمائندوں کی تعداد صرف چھ تھی۔ لیکن بالشویکی جماعت حقیقتاً مزدوروں کی تین چوتھائی حصے کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اس لئے ڈیوما میں بھی بالشویکوں کا اثر غالب رہا۔ ۱۹۱۴ء کے آغاز میں ہڑتالوں کی پھر کثرت ہونے لگی۔ جنوری کے مہینے میں ڈھائی لاکھ مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ یکم مئی کو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۱۴ء کے نصفِ اول میں ہڑتالی مزدوروں کی تعداد چودہ لاکھ ۲۵ ہزار تھی۔ اس نوبت پر جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ یہ جنگ انقلابی تحریک کی مستقبل کے لئے بہت اہم تھی۔ زاروں نے بھی جنگ کے حالات سے فائدہ اٹھا کر بالشویکی تنظیمات کو کچلنے کی پوری کوشش کی۔[1]

جنگِ عظیم اور بالشویکوں کی بین الاقوامیت

جنگِ عظیم میں روس، انگلستان اور فرانس کے ساتھ جرمنی کے خلاف شریکِ جنگ ہوا۔ مغربی جمہوریتوں کے ساتھ روس کے تحالف کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ۱۹۱۴ء سے قبل روس کی تمام کلیدی صنعتیں بیرونی سرمایہ داروں اور بالخصوص فرانسیسیوں، انگریزوں اور بلجیم کے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں تھیں۔ دھات کے کارخانے فرانسیسی سرمایہ سے قائم تھے۔ اسی طرح ڈانٹز ( ) کی وادی میں کوئلہ کی تمام پیداوار بیرونی سرمایہ کی امداد پر موقوف تھی۔ تیل کے نصف سے زائد چشمے انگریز اور فرانسیسی سرمایہ داروں کی ملک تھے۔ روسی صنعت کے منافع کا ایک بڑا حصہ انگریزوں اور فرانسیسی سرمایہ داروں کی جیب میں جاتا تھا۔

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام صہ ۹۸، ۹۹ [2] ایضاً صہ ۹۹ [3] ایضاً صہ ۹۹، ۱۰۰

علاوہ ازیں زار روس نے ان ملکوں سے بڑی بڑی رقوم بطور قرض حاصل کی تھیں ان حالات میں روس کی سیاست لازمی طور پر مغربی یورپ کے مصالح کے تابع تھی۔ علاوہ ازیں زار روس اور اس کی حکومت کے اصل پشت پناہ بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار تھے۔ جن کے نمائندے ڈیوما میں اکثریت رکھتے تھے۔ اور خارجی حکمت عملی کے پرجوش حامی تھے۔ درمیانی اعتدال پسند طبقہ کی پارٹی جسے دستوری جمہوری پارٹی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اگرچہ بظاہر جنگ کی مخالف تھی لیکن درپردہ زار کی بیرونی پالیسی کی حمایت کر رہی تھی۔

آغازِ جنگ سے ہی منشویک اور نچلے درمیانی طبقوں کی پارٹیاں اشتراکی اصولوں کے پردے میں جنگ کی مؤید تھیں۔ روس کے باہر وہ تمام اشتراکی پارٹیاں جو سیکنڈ انٹرنیشنل کے تحت جرمنی، فرانس اور دیگر ممالک میں قائم تھیں جنگ چھڑنے سے قبل لڑائی کی مخالف تھیں لیکن جب لڑائی شروع ہو گئی تو اپنے ممالک کو جنگی امداد دینے پر آمادہ ہو گئیں۔ اس طرح سیکنڈ انٹرنیشنل کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ اور ہر ملک کی اشتراکی جماعت اپنے ملک کے سرمایہ داروں اور درمیانی طبقوں کا ساتھ دینے لگی۔ صرف بالشویک پارٹی جنگ کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی بین الاقوامیت پر ثابت قدم رہی۔ اس نے قومی مفادات اور وطنی احساسات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور تمام ملکوں کے مزدوروں سے مطالبہ کیا کہ وہ جنگی امداد سے ہاتھ اٹھا لیں۔[1]

معاشی بحران اور عوام کا غیظ و غضب

جنگ شروع ہوئے تین سال ہو چکے تھے ہزاروں لاکھوں آدمی موت کے منہ میں جا چکے تھے۔ مزدوروں اور کسانوں کی مصیبتیں ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھیں۔ ملک کی معاشی حالت روز بروز ابتر ہو رہی تھی۔ تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ آدمیوں کو ان کے معاشی کاروبار سے الگ کر کے فوج میں بھرتی کر لیا گیا تھا۔ زرعی مزدوروں کی کمی کے باعث قابلِ کاشت زمینیں بیکار ہو گئیں۔ غذائی قلت کی وجہ سے ملک کی عام آبادی فاقہ زدہ ہو رہی تھی اور ہر جنگ کے میدانوں میں زار کی افواج کو پیہم شکستیں اٹھانی پڑ رہی تھیں۔ ۱۹۱۶ء تک جرمنی نے پولینڈ اور بالٹک کے بعض صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ اس صورت حال نے مزدوروں اور کسانوں اور درمیانی طبقوں کو زار اور اس کی حکومت سے متنفر کر دیا۔ کسان اور مزدور ہی نہیں بلکہ درمیانی طبقہ بھی یہ یقین کرنے لگا تھا کہ زار کی حکومت کامیابی کے ساتھ جنگ نہیں لڑ سکتی۔ جیسے جیسے روسی فوجوں کو شکستیں ہوتی گئیں۔ روس کا معاشی انتشار

[1] روس میں مسلمان قومیں صہ ۱۰۰، ۱۰۱

بڑھتا گیا۔ جنوری ۱۹۱۷ء میں غذائی صورت حال بہت نازک ہو گئی۔ خام پیداوار اور ایندھن کی فراہمی بالکل مسدود ہو گئی۔ کارخانے بند ہونے لگے جس کی وجہ سے بیروزگاری پھیل گئی۔ ملک کی تمام آبادی یہ محسوس کرنے لگی کہ اس ناقابلِ برداشت صورت حال سے خلاصی حاصل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ زار کی استبدادانہ حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے۔[1]

۱۸ فروری ۱۹۱۷ء کو پیٹروگراڈ کے ایک کارخانے میں ہڑتال ہوئی۔ ۲۲ فروری کو تمام بڑے بڑے کارخانوں کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ ۲۳ فروری کو مرد اور عورتیں بازاروں میں جمع ہو کر بھوک، جنگ اور زارِ روس کی حکومت کے خلاف مظاہرے کرنے لگے۔ ۲۴ فروری کو اس مظاہرے میں اور شدت پیدا ہو گئی۔ اور ہڑتال کرنے والے مزدوروں کی تعداد تقریباً دو لاکھ ہو گئی۔ پولیس اور مزدوروں کے درمیان جا بجا تصادم ہونے لگا۔ بازاروں میں ہر طرف مزدوروں کے جھنڈے نظر آتے تھے جن پر یہ نعرے لکھے ہوئے تھے۔

"زار کی حکومت کا تختہ الٹ دو"۔ "جنگ کا خاتمہ کر دو"۔ "ہمیں روٹی چاہیے"۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ یہ مظاہرے مسلح بغاوت میں تبدیل ہو گئے۔ مزدوروں نے پولیس سے ہتھیار چھین کر خود کو مسلح کرنا شروع کر دیا۔ ۲۶ فروری کو فوج کے سپاہیوں نے جنہیں مزدوروں پر گولیاں چلانے کا حکم دیا گیا تھا پولیس کے سواروں پر گولی چلا دی۔ انقلابیوں اور بالخصوص مزدور عورتوں نے فوجی سپاہیوں کو اپنی طرف ملانے کی ایک زبردست مہم شروع کی۔ عورتیں خود سپاہیوں کے پاس جا کر ان سے میل جول بڑھاتیں اور انہیں زار کی حکومت کے خلاف آمادۂ بغاوت کرتی تھیں۔

۲۷ فروری کو پیٹروگراڈ کی مسلح افواج نے مزدوروں پر گولی چلانے سے صاف انکار کر دیا۔ اور انقلابی بغاوت میں عوام کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ سپاہیوں اور مزدوروں نے مل کر زار کے وزراء اور فوجی جنرلوں کو گرفتار شروع کر دیا۔ نیز انقلابیوں کو رہا کر دیا۔ جو سرکاری جیل خانوں میں مدت سے قید تھے۔ جب یہ خبر اضلاع اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں پھیلی کہ پیٹروگراڈ (سینٹ پیٹرزبرگ) میں انقلابی جماعت نے زار کی حکومت کا تختہ الٹ دیا ہے تو ہر شہر اور قصبہ میں مزدوروں اور سپاہیوں نے عہدہ داروں کو معزول کرنا شروع کر دیا۔[2]

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام صفحہ ۱۰۳-۱۰۴

[2] " " " صفحہ ۱۰۴-۱۰۵

عارضی حکومت اور بالشویکوں کی چھٹی کانگریس

۲۷ فروری ۱۹۱۷ء کو چوتھی ڈیوما کے جمہوریت پسند اراکین نے منشویکوں اور معاشرتی انقلابیوں کی شہ سے ڈیوما کی ایک عارضی کمیٹی ترتیب دی جس کا صدر ایک شاہ پرست زمیندار تھا۔ چند دنوں کے بعد اس عارضی کمیٹی نے بالشویکوں سے چھپا کر خفیہ طور پر سوویٹ کے مجلس تنقیدی کے منشویک اور معاشرتی انقلابی رہنماؤں کی تائید سے ایک اعتدال پسند عارضی حکومت قائم کی جس کا صدر شہزادہ لووو (LVOV) تھا جسے زار نکولاس دوم جیسا شخص کچھ عرصہ قبل وزیر اعظم بنانے کی فکر میں تھا۔ اس طرح سوویٹ کی مجلس تنقیدی کے منشویک اور دیگر مصالحت پسند لیڈروں نے درمیانی اعتدال پسند طبقوں کے سامنے سپر ڈال دی۔ اور حکومتی اقتدار ان کے حوالے کر دیا۔ بالشویکوں کے احتجاج کے باوجود مزدوروں اور کسانوں کے نائبین کے سوویٹ نے کثرت رائے سے اس کارروائی کو منظور کر لیا۔

مزدوروں اور سپاہیوں نے اپنے نمائندوں کو سوویٹوں میں یہ سمجھ کر بھیجا تھا کہ سوویٹ عوام الناس کی مقتدر جماعتیں ہیں۔ اس لئے وہ انقلاب پسند عوام کے جملہ مطالبات کی تکمیل کریں گے۔ لیکن اس توقع میں اسے مایوسی ہوئی اب روس میں ایک نیا اقتدار وجود پذیر ہوا جس پر درمیانی اعتدال پسند طبقات کا قبضہ تھا۔ لیکن درمیانی اعتدال پسند طبقوں کی حکومت کے علاوہ روس میں ایک اور طاقت بھی کارفرما تھی جس کی تائید و اعانت سے درمیانی طبقوں کو حکومت حاصل ہوئی تھی یہ طاقت مزدوروں اور سپاہیوں کے نائبین کے سوویٹوں (Soviet, Workers and Soldiers Deputies) کی تھی۔ سوویٹ درحقیقت اس اتحاد کا مظہر تھے جو مزدوروں اور کسانوں نے زار کی حکومت کے خلاف قائم کیا تھا۔ بالشویکوں کے سامنے اصل کام یہ تھا کہ وہ عارضی حکومت کی ملوکیت پسندی کا پردہ چاک کر کے عوام الناس پر اس کی اصل حقیقت ظاہر کر دیں۔ نیز انہیں منشویکوں اور معاشرتی انقلابین کی اس غداری اور بے وفائی سے بھی آگاہ کریں۔ جس کی وجہ سے سوویٹوں میں ان کے نمائندوں نے ملوکیت پسند عارضی حکومت کے قیام پر صاد کیا تھا۔ فروری کے انقلاب کے پانچ دن بعد سے پراودا اخبار پیٹروگراڈ سے شائع ہونے لگا۔ تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ ماسکو میں بھی بالشویکوں کا ایک اخبار نکلنے لگا۔ غرضیکہ بالشویک پھر سے عوام کی قیادت حاصل کر رہے تھے۔ کیونکہ عارضی حکومت پر سے عوام کا اعتماد

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام: ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷

اٹھتا جا رہا تھا۔[1]

۱۶؍ اپریل ۱۹۱۷ء کو لینن روس واپس آیا۔ اور فوراً ہی پوری سرگرمی کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے اپنے حامیوں پر یہ بات واضح کر دی کہ بالشویک پارٹی اب بھی اقلیت میں ہے۔ اور سوویٹوں پر منشویکوں اور دیگر مصالحت پسندوں کا قبضہ ہے۔ اس نے یہ بھی صاف صاف بتا دیا۔ کہ ابھی وہ عارضی حکومت کا خاتمہ نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کی پہلی کوشش ہوگی۔ کہ بالشویکوں کو سوویٹوں میں اکثریت حاصل ہو جائے۔ حصولِ اکثریت کے بعد وہ حکومت کی ترکیبی اور پالیسی میں تبدیلی کرنے کی جدوجہد شروع کر دے گا۔ لینن نے اس امر پر بھی زور دیا کہ اب بالشویکوں کو اپنی پارٹی کا نام بدلنا چاہئے۔ یعنی معاشرتی جمہوریئین کا نام ترک کر کے کمیونسٹ پارٹی کا لقب اختیار کرنا چاہئے۔ لینن نے تھرڈ انٹرنیشنل کے قیام کا بھی مطالبہ کیا۔ کیونکہ سیکنڈ انٹرنیشنل کے تحت جتنی اشتراکی پارٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ سب کی سب مصالحت پسند بن گئی تھیں۔ اور ان میں انقلابی جوش باقی نہیں رہا تھا۔ ادھر بالشویک انقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ادھر عارضی حکومت مخالف عوام سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ ۱۸؍ اپریل کو حکومت کے وزیر خارجہ نے اعلان کیا کہ ملک تمام باشندے جنگ جاری رکھنا چاہتے ہیں اور عارضی حکومت ان تمام واجبات کی ادائیگی کا ذمہ لیتی ہے جو اس کے حلیفوں نے اس پر عائد کئے ہیں۔ ۱۹؍ اپریل کو اس اعلان کی خبر مزدوروں اور کسانوں تک پہنچ گئی اور بالشویک پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے عوام سے مطالبہ کیا کہ وہ عارضی حکومت کی اس پالیسی کے خلاف مظاہرہ کریں۔ ۲۱ اور ۲۲؍ اپریل کے مظاہروں میں تقریباً ایک لاکھ مزدوروں نے شرکت کی۔ اسی وقت سے عارضی حکومت ایک نازک صورتِ حال سے دوچار ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲؍ مئی ۱۹۱۷ء کو عوام کے دباؤ سے دو وزیروں کو حکومت سے نکال دیا گیا اور ایک مشترکہ (COAL TION) حکومت قائم ہوئی جس میں منشویکوں کے دو نمائندے شامل تھے۔[1]

۲۴؍ اپریل ۱۹۱۷ء کو بالشویک پارٹی کی چھٹی کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے لینن نے بتایا کہ بالشویکوں کا کام یہ ہے کہ وہ انقلاب کی پہلی منزل سے جس میں اقتدار اعتدال پسند درمیانی طبقوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ دوسری منزل کی طرف قدم بڑھائیں جس میں غریب مزدوروں اور کسانوں کو اقتدار ملے[2]۔ کانفرنس میں انقلاب کے مسئلے پر اختلاف رائے بھی پیدا ہوا۔ بعض اراکین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ روس ابھی اشتراکی انقلاب

---

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام ص ۱۰۷، ۱۰۸

کے لئے تیار نہیں ہے۔ کانفرنس میں زرعی مسئلے اور روس کی مختلف قومیتوں کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ زرعی مسئلہ کے بارے میں کانفرنس نے یہ قرار داد منظور کر لی کہ بڑی بڑی جاگیریں ضبط کر کے کسانوں میں تقسیم کی جائیں۔ اور زرعی اراضی کو اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے۔ لینن اور سٹالن دونوں کی پہلے سے رائے یہ تھی کہ بالشویکوں کو روس کے مظلوم اقوام کی تحریکاتِ آزادی کا ساتھ دینا چاہئے۔ چنانچہ بالشویکوں نے مملکت روس کی مختلف اقوام کی حق خود اداریت کو تسلیم کر لیا جس میں یہ حق بھی شامل تھا کہ اگر وہ چاہیں تو روس کی مرکزی حکومت سے الگ ہو کر اپنی جداگانہ مملکتیں تشکیل دیں۔ بالشویکوں کے اس اخلاص کی وجہ سے روس کی تمام مظلوم اقوام ان کے ساتھ ہو گئیں۔[1]

بالشویک ابتلاء کے نئے دور میں

اپریل کی پارٹی کانفرنس کے بعد بالشویکوں نے اپنا ہم نوا بنانے اور انہیں انقلابی شورش کی تربیت دینے کے لئے وسیع پیمانے پر کام شروع کیا۔ کارخانوں، مزدوروں کی انجمنوں اور سوویٹوں میں کام کرنے کے علاوہ بالشویکوں نے مسلح افواج میں بھی اپنا پروپیگنڈا کیا۔ ہر شہر اور ہر قصبہ میں بالشویکوں کی فوجی تنظیمات قائم ہو گئیں، مزید برآں انہوں نے محاذ جنگ پر اور ملک کے اندر سپاہیوں کو اپنانے اور انہیں سرگرم انقلابی بنانے کی پوری پوری کوشش کی۔ ۳؍ جون ۱۹۱۷ء کو تمام ملک کے سوویٹوں کی پہلی کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں بالشویک ارکان اقلیت میں تھے۔ سات آٹھ سو منشویکوں اور معاشرتی انقلابین کے مقابلے میں بالشویکوں کے صرف سو نمائندے تھے۔ لینن نے کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ صرف سوویٹوں کے حکومت کے قیام سے ملک فاقہ کشی سے بچ سکتا ہے۔ کسانوں کو زمینیں مل سکتی ہیں۔ اور جنگ سے دستبرداری اختیار کی جا سکتی ہے۔ لینن اور بالشویکوں کی مساعی کے باوجود سوویٹوں کی پہلی کانگریس نے عارضی حکومت کی موافقت کی۔ اور اس تائید کے سہارے عارضی حکومت نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو خوش کرنے کے لئے روسی افواج کو ایک عام اقدام کا حکم دیا۔ درمیانی اعتدال پسند طبقوں کی حکومت کو توقع تھی کہ اگر یہ اقدام کامیاب ہو گیا تو اسے عوام کی تائید حاصل ہو جائے گی۔ اور بالشویکوں کی طاقت ٹوٹ جائے گی۔ ناکامی کی صورت میں سارا الزام بالشویکوں کے سر تھوپ دیا جائے گا۔ کہ انہوں نے افواج میں انتشار پیدا کیا۔ بالآخر یہ فوجی اقدام بالکل ناکام رہا۔ جب اس کی خبر پیٹروگراڈ کے مزدوروں اور کسانوں کو ہوئی تو ان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ بلکہ جولائی کو پیٹروگراڈ میں حکومت کے خلاف

---

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام ص ۱۰۸، ۱۰۹

مظاہرے شروع ہو گئے ان مظاہروں نے بالآخر ایک مسلح مجمع کی صورت اختیار کر لی جس کا مطالبہ یہ تھا کہ سارے حکومتی اختیارات سوویٹوں کو دے دیے جائیں۔ بالشویک پارٹی اس موقعہ پر مسلح کارروائیوں کی مخالف تھی کیونکہ ابھی تک فوج میں اور صوبوں میں کافی انقلابی جوش نہیں پیدا ہوا تھا۔ اگر صرف دارالسلطنت میں شورش برپا کی جاتی اور صوبوں میں کوئی ہلچل نہ ہوتی تو مخالفین انقلاب کے لئے شورش کا دبا دینا آسان ہو جاتا۔ لیکن جب بالشویکوں نے دیکھا کہ مجمع کا جوش کسی طرح کم نہیں ہوتا تو وہ خود مظاہرے میں شریک ہو گئے تا کہ مجمع کو قابو میں رکھ سکیں۔ باوجودیکہ یہ مظاہرہ بالکل پُرامن تھا لیکن عارضی حکومت نے اس کے خلاف فوج طلب کی۔ اور پیٹرو گراڈ کی سڑکوں پر خون کی ندیاں بہا دیں۔ مظاہروں کو کچلنے کے بعد منشویکوں اور معاشرتی جمہوریین نے جو عارضی حکومت کے رکن رکین تھے بالشویک پارٹی کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی۔ بالشویکی اخباروں کی اشاعت مسدود کر دی گئی۔ ان کے مطابع بند کر دیے گئے۔ بالشویکوں کو ملک کے ہر گوشہ میں گرفتار کیا جانے لگا۔

۷ جولائی کو عارضی حکومت نے لینن کے نام گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا۔ اس طرح عارضی حکومت جس میں منشویکوں اور معاشرتی جمہوریین جیسے اشترا کی عناصر شامل تھے ملوکیت اور استعماریت کا پورا پورا مجسمہ بن گئی۔ امن قائم کرنے کی جگہ اس نے جنگ جاری رکھنے کی پالیسی اختیار کی۔ عوام کی آزادیوں کو برقرار رکھنے کی بجائے اس نے ان آزادیوں کو سلب کرنا شروع کر دیا۔ کسانوں اور مزدوروں کو کچلنے کے لئے تشدد کا حربہ استعمال کیا۔ نتیجۃً وہ دُہرا اقتدار ختم ہو گیا۔ جو حکومت میں سوویٹوں کے منشویک اور معاشرتی انقلابی نمائندوں کی شرکت کے باعث قائم ہوا تھا۔ حکومت کا اصل اقتدار درمیانی اعتدال پسند طبقات کے ہاتھ میں آ گیا۔ تبدیل شدہ حالات کے لحاظ سے بالشویک پارٹی نے علانیہ طور پر کام کرنے کے بجائے خفیہ طریقہ پر کام کرنا شروع کیا۔[۱]

نئی زندگی نیا کام

بالشویک پارٹی کی ساتویں کانگریس ۲۶ جولائی ۱۹۱۷ء کو بمقام پیٹرو گراڈ منعقد ہوئی۔ اخبارات میں صرف کانگریس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا تھا۔ اجلاس کا مقام پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ لینن اس کانگریس میں شریک نہ ہو سکا۔ کیونکہ عارضی حکومت نے اس کی گرفتاری کے

[۱] اشتراکیت اور نظام اسلام صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱

اپنے کارندے ہر طرف پھیلا رکھے تھے۔ لیکن اس نے اپنے مقام پوشیدگی سے کانگریس کی راہنمائی کی۔ عارضی حکومت بالشویکوں پر جو مظالم کر رہی تھی اس کی وجہ سے بالشویک پارٹی کی مقبولیت میں اور اضافہ ہو رہا تھا مزدور اور سپاہی منشویکوں اور معاشرتی انقلابین کو چھوڑ کر جوق در جوق بالشویک پارٹی میں شرکت کی درخواست کر رہے تھے۔ عارضی حکومت کے اعتدال پسند عناصر کی روش کے پیش نظر پُرامن انقلاب کا امکان ختم ہو گیا اور یہ ظاہر ہو گیا کہ تشدد اور خوں ریزی کے بغیر انقلاب پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ بالشویکوں کی کانگریس نے اپنے تمام فیصلوں میں لینن کے اصول پر زور دیا کہ اشتمالی انقلاب کے لئے مزدوروں اور کسانوں کا اتحادِ عمل ضروری ہے۔ کانگریس نے ایک عارضی منشور [illegible] بھی جاری کیا جس میں مزدوروں، سپاہیوں اور کسانوں کو مسلح بغاوت پر آمادہ ہو جانے اور اعتدال پسند درمیانی طبقوں کے خلاف اپنی قوتیں مجتمع کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔[۱]

اعتدال پسند درمیانی طبقوں نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اب سوویٹوں کو مٹانے اور ایک مخالف انقلاب آمریت قائم کرنے کی تیاری شروع کی۔ محاذِ جنگ پر جنرل کارنیلو (KARNILO) جو افواج کا کمانڈر انچیف تھا۔ ان سب سپاہیوں کو موت کی سزا دینے لگا جن کے متعلق اسے انقلابی میلانات کا شبہ تھا۔ اس نے عارضی حکومت سے مطالبہ کیا کہ مزدوروں اور سپاہیوں کی سوویٹوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ متحدین کے نمائندے بھی کارنیلو پر زور دے رہے تھے کہ انقلابی ہیجان کے خلاف کارروائی کرنے میں تعویق نہ کی جائے چنانچہ کارنیلو نے اعلانیہ طور پر تحریک کو کچلنے کی تیاریاں شروع کیں اور پیٹرو گراڈ پر حملہ کرنے کے لئے فوجیں جمع کیں۔ تا کہ وہاں کے سوویٹوں کو توڑ دیا جائے۔ اور فوجی آمریت قائم کر دی جائے۔ ۱۵ اگست ۱۹۱۷ء کو کارنیلو نے پیٹرو گراڈ کے خلاف اپنی افواج کو حرکت دی۔ بالشویکوں کی مرکزی کمیٹی نے مزدوروں اور کسانوں سے مطالبہ کیا کہ وہ مخالف انقلاب طاقت کا پوری قوت کے ساتھ مسلح ہو کر مقابلہ کریں۔ چنانچہ مزدوروں نے اپنے آپ کو ہتھیار بند کرنا شروع کیا۔ سرخ محافظ دستے ہر طرف کثیر تعداد میں نظر آنے لگے۔ مزدوروں کی انجمنوں نے اپنے ارکان کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ پیٹرو گراڈ کے چاروں طرف خندقیں کھودی جانے لگیں۔ اور ریل کے تمام راستوں کو جو شہر کی طرف جاتے تھے بالکل برباد کر دیا گیا۔ ان سب تدابیر

[۱] اشتراکیت اور نظام اسلام صفحہ ۱۱۱

کا اثر یہ ہوا کہ کارنیلو کو اپنی مخالف انقلاب مہم میں ناکامی ہوئی اور اس کی قوت کو کچل دیا گیا۔ کارنیلو کی شکست نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھا دیا کہ جنگ کو ناقابلِ برداشت حد تک طوالت دینے سے اور معاشی ابتری کے باعث جو اس طوالت کا لازمی نتیجہ تھا منشویکوں اور معاشرتی انقلابیوں کا اثر عوام پر سے بالکل جاتا رہا۔ نیز یہ امر بھی سب پر عیاں ہو گیا کہ بالشویک پارٹی ایک فیصلہ کن طاقت بن گئی ہے۔ اگرچہ اس پارٹی کو ابھی اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا۔ لیکن کارنیلو کے اقدام کے زمانے میں اس نے حکمران پارٹی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ کیونکہ مزدور اور سپاہی اس کے احکام و ہدایات پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔ کسانوں کا کثیر التعداد طبقہ بھی بالشویکوں سے قریب تر آ گیا کیونکہ اسے یقین ہو گیا کہ صرف بالشویک پارٹی انہیں جنگ کے مصائب سے نجات دلا سکتی ہے اور زمینداروں کی طاقت کو کچل کر انہیں اراضی واپس دلا سکتی ہے۔ اور زمینداروں کی طاقت کو کچل کر انہیں اراضی واپس دلا سکتی ہے۔ ان تمام امور کے پیشِ نظر یہ ظاہر تھا کہ اب بالشویکوں کی مسلح بغاوت کے لئے حالات سازگار ہو گئے تھے۔[1]

عارضی حکومت کا خاتمہ اور سُرخ انقلاب

۷ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو لینن فن لینڈ سے خفیہ طور پر پیٹروگراڈ آیا۔ ۱۰ اکتوبر کو بالشویکوں کی مرکزی پارٹی کا وہ اجلاس منعقد ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ چند دنوں میں مسلح بغاوت کا علم بلند کرنا چاہئے مرکزی کمیٹی نے اپنے نمائندے ملک کے اطراف و اکناف میں پھیلا دئے۔ تا کہ وہاں پہنچ کر وہ انقلابی باغیانہ کارروائیوں کی رہنمائی کریں۔ اسی اثنا میں مخالفین انقلاب بھی اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے (Officers League) کے نام سے ایک مخالف انقلاب تنظیم قائم کی۔ اور افواج کو مجتمع کرنے کے لئے ہر جگہ مستقر قائم کرنے شروع کئے۔

۱۶ اکتوبر کو عارضی حکومت نے محاذِ جنگ سے بعض افواج طلب کیں۔ ۲۱ اکتوبر کو بالشویکوں نے اپنے انقلابی فوجی مجالس کے نمائندوں کو ان تمام فوجی یونٹوں کے پاس رہنمائی کی غرض سے روانہ کیا جو انقلاب کی حامی بن چکی تھیں۔ عارضی حکومت نے ۲۴ اکتوبر کی صبح کو انقلابی تحریک پر اپنا وار کیا۔ اس نے بالشویک پارٹی کے صحافتی ترجمان (Rabochy Put) کی مسدودی کا حکم دے کر اس کی اداراتی عمارت اور مطبع کو

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام ص ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳

گھیرنے کے لئے مسلح فوجی گاڑیاں روانہ کیں۔ لیکن سرخ محافظ دستوں اور انقلابی افواج نے ان گاڑیوں کو پیچھے دھکیل کر مطبع پر ایک مزید محافظ فوجی دستہ کھڑا کر دیا۔ ۱۱ بجے اخبار کا پرچہ شائع ہوا جس میں عارضی حکومت کو الٹ دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد عام مسلح بغاوت شروع ہو گئی۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو سرخ محافظ دستوں اور انقلابی افواج نے پیٹروگراڈ کے ریلوے سٹیشنوں، ڈاک خانوں، تار گھروں، وزارتی عمارات اور ریاستی بینک پر قبضہ کر لیا۔ پیٹروگراڈ کے مزدوروں نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ انہوں نے بالشویک پارٹی کی رہنمائی میں نہایت اعلیٰ درجہ کی انقلابی تربیت حاصل کر لی ہے۔ فوج کی انقلابی یونٹوں کو جنہیں بالشویکوں نے مسلح بغاوت کے لئے تیار کیا تھا۔ لیڈروں کی ہدایات پر لفظ بہ لفظ عمل کر دکھایا۔ اور سرخ محافظ دستوں کے ساتھ لڑائی میں شریک رہیں۔ بحریہ نے بھی انقلابی کارروائیوں میں پورا حصہ لیا۔ ۲۵ اکتوبر کو بالشویکوں نے عارضی حکومت کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ اسی رات انہوں نے عارضی حکومت کے ارکان کو گرفتار کر لیا۔ اس طرح پیٹروگراڈ کی انقلابی بغاوت پوری طرح کامیاب ہوئی۔ اسی تاریخ کو سوویٹوں کی دوسری کانگریس منعقد ہوئی۔ جس میں بالشویکوں کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی۔ منشویکوں اور معاشرتی انقلابیوں نے اقتدار ہاتھ سے جاتے دیکھ کر کانگریس کے مباحث میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ کانگریس نے باضابطہ طور پر اعلان کیا کہ سارے ملکی اور حکومتی اختیارات سوویٹوں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں۔ اور عارضی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس طرح سے زار شاہی قصرِ حکومت کی اس آخری اینٹ کو بھی دو نیم کر دیا۔

۲۶ اکتوبر کی شب کو دوسری سوویٹ کانگریس نے متحاربین کو اطلاع دی کہ وہ فوراً تین ماہ کے لئے عارضی صلح کریں۔ تاکہ اس دوران میں مستقل صلح کے لئے گفت و شنید کی جا سکے۔ اسی شب کو کانگریس نے زرعی اراضی کے متعلق احکام جاری کئے۔ اور یہ اعلان کیا کہ زمینوں پر سے زمینداروں کا قبضہ بلا ادائگی معاوضہ ختم کر دیا گیا ہے تمام معدنی وسائل جمہور کی مشترکہ ملکیت میں دے دئے گئے ہیں۔[1]

پرولتاری آمریت کا قیام و استحکام

دوسری کانگریس نے سب سے آخری کام یہ کیا کہ پہلی سوویٹ حکومت کی تشکیل کی یعنی جمہور کی مجلس وزراء

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام ص ۱۱۳، ۱۱۴

قائم کی جس کا پہلا صدر نشین لینن مقرر ہوا۔ اگرچہ بالشویک پارٹی پیٹرو گراڈ میں کامیاب ہو چکی تھی۔ لیکن دور مقامات پر سوویٹوں کو ملکی اقتدار حاصل کرنے میں دیر لگی۔ بالخصوص ماسکو میں سخت خون ریز کش مکش کے سوویٹوں کو کامیابی ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء اور فروری ۱۹۱۸ء کے درمیان سوویٹ انقلاب کی آگ روس جیسے وسیع ملک کے ہر گوشے میں پھیل گئی۔ اور اکتوبر کا اشتمالی انقلاب پورے طور پر کامیاب ہو گیا۔ یہی مارکس کی آرزو تھی۔ اور یہی اس کے سچے جانشین لینن کی اس طویل جد و جہد کا مدعا تھا[1]۔

اس اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے اعتدال پسند درمیانی طبقوں کی معاشی طاقت اور سیاسی اثر مٹانا تھا۔ چنانچہ سوویٹ حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی جاگیرداری کے آثار و باقیات کو ایک ایک کر کے شروع کیا۔ اس سلسلے میں نئی حکومت نے پہلا کام یہ کیا کہ تمام جاگیرات ضبط کر لیں۔ مذہب اور قومیت کی بنا پر جو امتیازات زار کی حکومت میں روا رکھے گئے تھے انہیں اُٹھا لیا گیا۔ کلیسا کو ریاست سے اور مدارس کو سے الگ کر دیا گیا۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات قائم کر دی گئی۔ درمیانی طبقوں کا معاشی طاقت توڑنے اور سوویٹ معیشت کے قیام کی غرض سے بینکوں، ریلوں، بیرونی تجارت اور جملہ بڑی بڑی صنعتوں کو اجتماعی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ بیرونی سرمایہ داروں کے چنگل سے رہائی حاصل کرنے کے لئے سوویٹ نے اعلان کیا کہ زار کی حکومت اور عارضی حکومت نے بیرونی ممالک سے جو قرضہ جات حاصل کئے تھے سوویٹ حکومت ان کی ادائیگی کی ذمہ دار نہیں ہے۔ ان تدابیر سے درمیانی طبقوں، مخالف انقلاب عناصر اور رجعت پسند عناصر کی طاقت پر مہلک ضرب لگائی گئی۔ لیکن جرمنی اور آسٹریا ہنگری سے جنگ جاری تھی۔ حکومت کو استقلال نصیب ہونا مشکل تھا۔ اس لئے بالشویک پارٹی نے صلح کے لئے سلسلۂ جنبانی شروع کی اور تمام متحارب حکومتوں سے مطالبہ کیا کہ وہ فوراً ایک منصفانہ صلح کی گفت و شنید شروع کر دیں۔ لیکن فرانس اور انگلستان کی حکومتوں نے انکاری جواب دیا جس کے بعد بالشویکوں نے جرمنی سے صلح کی گفت و شنید کا آغاز کیا۔ سوویٹ حکومت مجبور تھی کہ وہ جرمنی سے سخت اور ناموافق شرائط پر صلح کرے کیونکہ اسی تدبیر سے وہ اقتدار کو مستحکم کرنے اور ایک نئی فوج (سرخ فوج) منظم اور تیار کرنے کی مہلت حاصل کر سکتی تھی۔ چنانچہ فروری ۱۹۱۸ء میں بالشویکوں اور جرمنوں کے درمیان بریسٹ لٹوسک

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام صہ ۱۱۴، ۱۱۵

اسلامی طے پائی جس کی رو سے بالٹک کی تمام ریاستوں (لیتھوینیا، استھونیا وغیرہ) سے روس کو ہاتھ دھونا پڑے۔ یوکرین کے صوبے کو بھی جرمنوں نے روس سے خارج کر کے ایک باجگذار ریاست بنا لیا۔ علاوہ ازیں سوویٹ حکومت کو جرمنوں سے تاوانِ جنگ کی ادائیگی کا وعدہ کرنا پڑا۔ اسی زمانہ میں بالشویک پارٹی کی ساتویں کانگریس منعقد ہوئی جس میں طے پایا کہ پارٹی کا نام "روسی کیمونسٹ پارٹی" رکھا جائے[1]۔



[1] اشتراکیت اور نظام اسلام صہ ۱۱۵، ۱۱۶

باب چہارم

سوشلزم کی چیرہ دستیاں

فکری سفر اور ایک طویل عملی جدوجہد کے بعد بالآخر سوشلزم کو وہ مقام..... اقتدار... نصیب ہوا جس کے بعد اس نے اس مجوزہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانا تھا جس کی کشش اور جاذبیت نے محنت کشوں کو اپنی طرف مائل اور جس کی آرزوئے حصول نے ان کو ایسا مدہوش اور بے حال کر دیا تھا۔ کہ بلا توقف اور بغیر کسی جھجک کے بڑی آسانی سے خاک و خون میں لتھڑ جانے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ یہ پروگرام کیا تھا؟ آزادی اور ہر قسم کی آزادی۔ یعنی دین و مذہب کی آزادی، تہذیب و تمدن کی آزادی، سیاست و معاشرت کی آزادی۔ قومی روایات اور ثقافت کی آزادی۔ غرض اس میں وہ ساری آزادیاں شامل تھیں جس کی امید دلا کر کسی انسان کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ اور اس کو اپنی مطلب برآری کے لئے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مجوزہ پروگرام میں تو یہ ڈھیروں آزادیاں اور معاشی مساوات کی دلفریبیاں مگر افسوس! کہ کرسیٔ اقتدار پر براجمان ہو جانے کے بعد ان میں سے کوئی چیز بھی سوشلسٹوں کی عملی پالیسی میں جگہ نہ پا سکی۔ آزادیوں کا گلا گھونٹا گیا۔ اور ایسا گھونٹا گیا۔ کہ تاریخ اس کو کوئی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اور معیشت کا وہ فرق جس کے مٹانے کے لئے یہ خون ریز انقلاب برپا کیا گیا تھا پہلے سے بھی زیادہ مہیب اور بھیانک شکل میں نمودار ہوا۔ روس میں آباد مسلمان قوموں کے ملی شیرازے کو بکھیرنے کے لئے اس ظالم و جابر نے کیا کیا۔ سامراجی ہتھکنڈے استعمال کئے اور اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کے لئے مکاری و عیاری کے کیا کیا نمونے قائم، اور ظلم و ستم کی کیسی کیسی داستانیں رقم کیں۔ اس باب میں انہی حقائق کا بالاختصار بیان ہو گا۔



قول و فعل کا تضاد

سوشلسٹ انقلاب برپا ہوتے ہی ملک میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ زار کی حامی سفید فوجیں، سرخ انقلابی فوجوں سے جنگ آزما تھیں۔ کئی محاذوں پر سرخ فوجیں بُری طرح پٹ رہی تھیں۔ کہنے کو ملک کی زمام بالشویکوں کے ہاتھ میں تھی، مگر چند بڑے بڑے شہر چھوڑ کر سارا ملک ان کے دائرۂ اقتدار سے باہر تھا۔ ایسی حالت میں انہوں نے روس کے مسلمانوں کی ہمدردیاں جیتنے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ایک اعلان جاری کیا جو سوشلسٹ روس کی تاریخ میں روسی انقلاب کا اعلان کہلاتا ہے۔ اس پر لینن کے دستخط تھے۔ اس میں کہا گیا تھا۔

• روس کے مسلمانو! والگا اور کریمیا کے ترکو اور تاتارو، ترکستان کے سارتو، ٹرانس کاکیشیا کے ترکو اور تاتارو، اور وہ سب لوگو۔ جن کی مسجدیں اور عبادت گاہیں تباہ کر دی گئیں۔ اور جن کا مذہب روسی زاروں اور غاصب فرماں رواؤں نے پامال کر دیا۔ آج سے تمہارے دین و ایمان، تمہاری روایات، تمہارے قومی اور ثقافتی اداروں کی آزادی اور حرمت و تحفظ کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اپنی قومی زندگی کی تعمیر آزادی سے اور بے روک ٹوک کرو۔ یہ تمہارا حق ہے۔ سوویٹ یونین تم سے صرف تعاون چاہتی ہے۔ عوامی کمیساروں کی کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ مختلف قوموں کے متعلق اپنی پالیسی کی بنیاد مندرجہ ذیل اصولوں پر رکھے گی :-

۱۔ روسی مسلمانوں کو مساوی حقوق اور حاکمیت حاصل ہوگی۔

۲۔ روسی قوموں کو حق خود اختیاری حاصل ہوگا۔[۱] نیز انہیں روس سے الگ آزاد ریاستیں قائم کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

قوموں کے حق خود اختیاری اور آزاد قومی ریاست کی مزید تشریح قومیتوں کے عوامی کمیسار Peoples Commissar of the Nationalities سٹالن نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کی :-

• تمام ملکوں کی سوشل جمہوریت عوام کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرنے کا اعلان کرتی ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی قوم کی درس گاہوں اور قوانین کو تباہ کرنے اور اس کے رسم و رواج اور عادات و روایات کو مٹانے کے لئے اس کی زندگی میں مداخلت کرے۔[۲]

لینن اور سٹالن کے یہ اعلانات بظاہر بڑے واضح۔ جاندار اور وزن دار معلوم ہوتے ہیں اور ان کو سن کر ان کی نیک نیتی اور انسان دوستی کا یقین ہونے لگتا ہے۔ لیکن عمل کی نوبت میں ان کی عملی کارگزاریوں کا مطالعہ کیا جاتے تو قول و عمل کے تضاد کا وہ بدترین نمونہ سامنے آجاتا ہے کہ انسانی عظمت و شرافت دم بخود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور "ناطقہ سر بگریبان کہ اسے کیا کہئے" والی کیفیت سے دوچار ہو جاتی ہے۔

زار شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد عبوری حکومت کے قائم ہوتے ہی مسلمان علاقوں نے روس کا سامراجی جُوا اتار پھینکا اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ سوشلسٹ انقلاب کے بعد اشتراکی قائدین نے بیانات ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اپنے حامیٔ دین اسلام ہونے کے دعوے کے ثبوت کے طور پر کچھ سطحی قسم کے اقدامات بھی کئے۔ سٹالن نے ۱۲ دسمبر ۱۹۱۷ء کو قرآن کریم کا ایک نسخہ جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب تھا اور پیٹرو گراد نیشنل لائبریری میں محفوظ تھا، مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں قازان کی ایک تاریخی یادگار مینار سوم بیک بھی ایک کمیٹی کی نگرانی میں دے دیا۔

یہ زبانی بیانات اور سطحی اقدامات مسلمانوں کو یہ باور کرانے کے لئے کئے جاتے رہے کہ سرخ انقلابی نہ صرف یہ کہ دین و مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی کے پابند ہیں بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر وہ تو اسلام اور مسلمانوں کے لئے اپنے دل کے اندر ایک نرم گوشہ بھی رکھتے ہیں اور ان کی خیر خواہی اور ملی نشو و نما کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

۱۔ Richard Pipes, the Formation of the Soviet Union Communism and Nationalism (1955) P. 155

۲۔ Agha Shaukat Ali Modernization of Soviet Asis - P. 27

اگرچہ یہ سب کچھ اشتراکیت کے دکھاوے کے دانت تھے اور مسلمانوں کو زار کی سفید فوجوں کی حمایت و تعاون سے باز رکھنے کی منافقانہ تکنیک تھی تاہم بڑی مؤثر ثابت ہوئی۔ مسلمانوں کی بھاری تعداد ان کے دام فریب میں آگئی اور سوشلسٹ روس کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگی۔

سوشلسٹوں کی یہ ظاہرداری اس وقت تک برابر جاری رہی جب تک کہ سفید فوجیوں میں کچھ بھی دم خم باقی تھی لیکن جونہی ان کی قوت مزاحمت کمزور پڑ گئی اور سوشلسٹ حکومت کے پاؤں مضبوطی سے جم گئے تو اس نے "اعلانِ انقلاب" کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اس کی فوجیں غاصب فرماں رواؤں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ان نوآزاد ریاستوں پر چڑھ دوڑیں اور انہیں ایک ایک کرکے نگل گئیں۔

سامراجی ہتھکنڈے

نیا سامراج اپنے پیشرو زارشاہی سامراج سے کسی طرح بھی کم نہیں بلکہ اس حیثیت سے تو اس سے بھی بدتر ثابت ہوا کہ زارشاہی استبدادی دَور میں روس کی محکوم قوموں کا اپنا اپنا قومی وجود اور تشخص بھی کسی نہ کسی صورت میں باقی اور برقرار رہا۔ اور وہ ایک حد تک اپنی ملی روایات کے پابند بھی رہے۔ لیکن سوشلسٹ روس میں ان کے انفرادی تشخص کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ شکل میں بھی برداشت نہیں کیا گیا۔ یہاں تو تمام لوگوں کو ماسکو کے تراشیدہ ایک ہی الحادی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی رہی اور اس کے لئے قسم قسم حیلے بہانے اختیار کئے جاتے رہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی نہایت سخت جان قوم لادینی جدت کے مقابلے میں دینی یا قومی رجعت و قدامت سے چمٹی رہی اور اپنی ملی زندگی کی حفاظت سے دست بردار ہونے پر راضی نہ ہوئی۔ تو اس کی ہستی تک کو ملیامیٹ اور زیروزبر کرنے میں بھی کسی تامل کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اور بلا توقف اس کے سلسلۂ زیست کو منقطع کرنے کا بندوبست کیا گیا۔

نوآباد قوموں کو روس کا غلام بنانے کے لئے اشتراکی منصوبہ ساز ایک خاص ترتیب سے سامراجی داؤ کھیلتے اور بالآخر ان کی قومی زندگی کا چراغ گل کر دیتے ان کے سامراجی ہتھکنڈوں کا استعمال کچھ اس ترتیب سے ہوتا کہ اوّلاً تو متعلقہ قوم ہی کے چند فریب خوردہ سادہ لوح یا بے حمیت ضمیر فروش آدمیوں سے مقامی سوشلسٹ پارٹی ڈلوائی جاتی اور پھر اس کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے ہر قسم کی امداد دی جاتی۔ ثانیاً پارٹی کے ارکان اور حامیوں کو مرکزی پارلیمنٹ، زیریں ایوانوں اور حکومت کے انتظامی اداروں میں وہ با اختیار عاملانہ آسامیاں دلائی جاتیں جن

کی بنا پر مملکت کی ساری پالیسیاں ان کی صواب دید پر بنتیں۔

اس مرحلے پر پہنچ کی مقامی حکومت کی بیشتر توانائیاں مقامی لوگوں کی تاریخ مسخ کرنے اور ان کو ان کے ماضی سے کاٹنے پر صرف ہوتیں۔ اس مہم میں نام نہاد مذہبی پیشواؤں کی خدمات بالخصوص حاصل کی جاتیں۔ ثالثاً روس کے اس ناپاک تسلط کے خلاف حکومت کے اندر یا باہر سے اگر کوئی مؤثر آواز یا قومی تحریک اٹھتی تو اپنے ان حلقوں سے اس کی مزاحمت کرائی جاتی بصورتِ دیگر روس نواز اقلیت کی اکثریت اور مظلومیت کی تشہیر اور پروپیگنڈا کرکے فوجی اقدام کا جواز پیدا کر لیا جاتا۔ اور پھر ایک عریاں جارحیت کے ذریعے پورے علاقے کو روسی نوآبادی میں تبدیل کر لیا جاتا۔

اپنے بالواسطہ یا بلاواسطہ اقتدار کے ابتدائی زمانے میں مذہب اور اہلِ مذہب کی بابت انتہائی رواداری سے کام لینا روسی سوشلسٹوں کا معروف و مشہور تکنیک چلا آرہا ہے۔ جس کو انہوں نے بلا استثناء ہر جگہ رُوبہ عمل لایا ہے۔ لیکن جونہی ان کو رسوخ حاصل ہو جائے بڑی بے جگری سے حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور اس وقت تک دم نہیں لیتے جب تک دونوں کا فاتحہ نہ پڑھ لیا جائے۔

پھر بات یہیں آکر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ مستقبل کے ہر خدشے کا ازالہ کرنے کے لئے مفتوحہ علاقوں کی قبائلی، نسلی اور جغرافیائی بنیادوں پر تقسیم در تقسیم اور اس کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا عمل شروع کیا جاتا ہے تاکہ ان کے اندر کسی ممکنہ مزاحمت کی اہلیت ہی باقی نہ رہے۔

ایدل اورال۔ داغستان۔ کریمیا۔ آذربائیجان اور ترکستان کے مسلمان علاقوں کو ہضم کرنے کے لئے موقع و محل کی مناسبت سے کم و بیش یہی ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ اسی طرح سے خیوا اور بخارا بھی روس کی اسی حکمتِ عملی کی فتوحات میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ جنگِ عظیم دوم کے معاً بعد عیسائی اکثریت والے علاقے، پولینڈ۔ چیکوسلواکیہ۔ ہنگری۔ رومانیہ اور بلغاریہ میں قریب قریب یہی عمل دہرایا گیا۔ اور اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔

ہم یہاں روس میں مسلمان علاقوں کے انضمام کی مختصر سی تفصیلات بیان کرتے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں اس ابھرتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے سامراج کے اصل خدوخال دیکھے جا سکیں اور افغانستان اور پاکستان کے مسلم ممالک میں اس کی تدریجی پالیسی کے مختلف مراحل کا مفید مطالعہ کیا جا سکے۔

ایدل اورال[1]

روس میں جمہوری حکومت قائم ہوتے ہی ماسکو میں کل روسی مسلم کانگریس منعقد ہوئی۔ جس میں تمام روسی مقبوضات کے نمائندے شریک ہوئے۔ کانگریس نے بھاری اکثریت سے مسلمان علاقوں کی خود مختاری کی تجویز منظور کی۔ اور ایک مفصل منصوبہ تیار کیا۔ روسی حکومت سے مذاکرات اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے ملی شوریٰ منتخب کی۔ ملی شوریٰ کا مرکز پیٹروگراڈ قرار پایا۔ اور اس کی صوبائی شاخیں قائم کر دی گئیں۔ اہم ترین شاخیں قازان اور اوفا میں تھیں۔

سوشلسٹ انقلاب کے بعد لینن اور سٹالن نے مسلمانوں کو اپنے ناپاک عزائم کا شکار بنانے کے لئے روز اول ہی سے دام تزویر بچھانا شروع کیا تھا۔ اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں انہوں نے نہ صرف پرفریب اعلانات کئے بلکہ سطحی قسم کے اقدامات کر کے مسلمانوں کے دل جیتنے کی کوشش بھی کی۔ مسلمانوں کو آزادی پرچم تلے مجتمع ہوتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ قومیتوں کے عوامی کمیسار سٹالن نے ۱۹۱۷ء میں ملی شوریٰ کے صدر احمد بے زالیکوف سے رابطہ قائم کیا اور اپنی حکومت کا تعاون حاصل کرنے کے لئے معقول اور مفید شرائط قبول کرنے کی تجویز پیش کی۔ احمد بے نے یہ تجویز ملی شوریٰ کی طلب کردہ مجلس ملت کے حوالے کر دی جس کا اجلاس اوفا میں ہو رہا تھا۔ مجلس نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور ایدل اورال کی متحدہ ریاست اور داخلی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور دستور ساز اسمبلی بنانے کا فرمان جاری کیا۔ اس نو آزاد ریاست کا سربراہ صدر مقصودی قرار پایا۔

لینن اور سٹالن نے جب دیکھا کہ مسلمان ان کے دام فریب کا آسانی سے شکار ہونے والے نہیں تو غداروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ جنوری ۱۹۱۸ء کو روسی مسلمانوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے روسی مسلمانوں کی مرکزی کمیساریٹ قائم کر دی گئی۔ اور قازان سوشلسٹ کمیٹی کے چیئرمین ملا نور وحیدوف کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اور اس کو تاتاریوں میں پھوٹ ڈالنے کا کام سپرد کیا گیا۔ سوشلسٹوں نے مسلمان علماء کے ایک حصے کو اسلام اور سوشلزم کا قریبی رشتہ ثابت کرنے اور رائے عامہ کو سوشلسٹوں کے حق میں ہموار کرنے کے لئے خوب خوب

---

[1] ایدل ایک دریا ہے۔ اور اورال ایک پہاڑ ہے۔ دریائے ایدل اور کوہ اورال کے درمیانی علاقے کو ایدل اورال کہتے ہیں۔ اب روسیوں نے دریائے ایدل کا نام وانگا (VOLGA) رکھ لیا ہے۔

استعمال کیا۔ ان بے بصیرت اور لالچی نام نہاد علماء نے سوشلزم کو عین اسلام قرار دیا۔ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح پہلی مرتبہ انہی لوگوں نے استعمال کی۔ ان کا لیڈر ایک داغستانی ملا آخر کو حاجی تھا۔ ایدل اورال میں یہ خدمت رسولوف نامی ملا سے لی گئی۔

ملا نور وحیدوف نے اپنے آقاؤں کا تفویض کردہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ مسلم کمیساریٹ قائم ہوتے ہی تاتاریوں کے قومی محاذ میں شگاف پڑ گیا۔ ان کا ایک گروہ ملا صاحب کی قیادت میں کمیونسٹوں سے جا ملا۔ ۸ فروری ۱۹۱۸ء کو قازان میں دوسری حربی شوریٰ[1] منعقد ہو رہی تھی۔ نور وحیدوف پیٹروگراڈ سے قازان پہنچا۔ اور ترغیب و تحریص اور ریشہ دوانیوں کے ذریعے تاتاریوں کی خاصی بڑی تعداد کو غداری پر آمادہ کر لیا۔ ۱۷ فروری کو غدار تاتاری حربی شوریٰ کے اجلاس سے نکل گئے۔ اور تاتاری فوجیوں پر مشتمل الگ فوج بنا لی تاہم اکثریت حربی شوریٰ کے ساتھ تھی۔ اور انہوں نے ایدل اورال کی حکومت کے قیام کی توثیق کر دی۔

مسلمانوں کو پھاڑنے کے بعد کمیونسٹوں نے فوری کارروائی کی۔ قازان کے یورپی حصے میں کمیونسٹ دستے پہلے ہی موجود تھے۔ پیٹروگراڈ سے مزید فوج پہنچ گئی۔ ۲۷ فروری کو قازان میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ حربی شوریٰ کے رہنما اور کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ جو بچ نکلے انہوں نے قازان کے مضافات میں پناہ لی۔ اور مورچے جمالئے۔ عین وقت پر حربی شوریٰ کے بعض دستوں نے جنہیں غدار ملا نور وحیدوف نے اندر ہی اندر سے ورغلا لیا تھا لڑنے سے انکار کر دیا۔ تاہم بچے کھچے آزاد تاتاری اپنی جانوں پر کھیل گئے۔ زبردست مزاحمت کے بعد کمیونسٹوں نے مورچے توڑ ڈالے۔ اور شہر کے تاتاری علاقے اور مضافات پر قبضہ کر لیا۔ حربی شوریٰ، مجلس ملت ملی شوریٰ اور مسلمانوں کی دوسری تحریکیں خلاف قانون قرار دے دی گئیں اور مسلمان فوجی دستے توڑ دیے گئے۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں روسی سوویت فیڈریشن کی "تاتار سوویٹ جمہوریہ" کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ سوویٹ ری پبلک ایدل اورال کی اس آزاد مملکت کی متبادل صورت تھی۔ جس کا خواب شکست کھانے والے قوم پرست تاتاریوں نے دیکھا تھا۔ اب اس پر کمیونسٹوں کی حکومت تھی۔ اس نئی ریاست کی حدود اس طرح متعین کی گئی تھیں کہ روسی آبادی والے وسیع علاقے اس میں شامل کئے گئے تھے۔ کچھ چھوٹے اقلیتی

---

[1] پہلی حربی شوریٰ جنوری ۱۹۱۷ء میں قازان میں منعقد ہوئی تھی۔ حربی شوریٰ اور روسی افواج کے مسلمان جوانوں پر مشتمل فوج بنانے کا فیصلہ دوسری کل روسی مسلم کانگریس کے اجلاس میں کیا گیا تھا جو انہی تاریخوں میں قازان ہی میں منعقد ہوا تھا۔

گروپ (چارس اور چرمس) بھی اس کے ساتھ ملا دئے گئے تھے۔ اور اس کی مجموعی آبادی میں تاتاریوں اور باشکیریوں کی کامل اکثریت نہیں رہی تھی۔ جون ۱۹۱۸ء میں وحیدوف نے اپنی کمیساریٹ کی صوبائی شاخوں کی ایک کانفرنس طلب کی۔ اور مسلمان کمیونسٹوں کی ایک دوسری جماعت قائم کر دی۔ اس کی اپنی مرکزی کمیٹی تھی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد روس میں وسیع پیمانے پر خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس خانہ جنگی میں چیکو سلاوی فوجوں اور بالشویک دستوں کے مابین خون ریز جھڑپیں ہوئیں اور چیکو سلاوی قومیت میں بالشویکوں کی مخالف قومیت قائم ہوگئی۔ چیکو سلاوی فوجوں نے قازان پر قبضہ کر لیا جو لوگ پکڑے گئے اس میں وحیدوف بھی تھا اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد پورے ایک سال تک ایدل اورال کا علاقہ سرخ و سفید روسی فوجوں کے درمیان خانہ جنگی کا منظر پیش کرتا رہا۔ تاتاریوں کو دونوں فوجوں نے بری طرح تاخت و تاراج کیا اور ان کے مستقبل کے منصوبے معرض تعویق و التوا میں پڑ گئے۔[1]

جنوبی سلسلہ اورال میں باشکیری آباد تھے۔ یہ لوگ در اصل تاتاریوں ہی کی شاخ تھے۔ روسی انقلاب برپا ہوا تو باشکیری تاتاریوں اور کمیونسٹوں کی کش مکش سے الگ تھلگ رہے۔ حریت پسندوں نے احمد زکی ولیدوف کی قیادت میں کل باشکیر کرلتائی (دستور ساز اسمبلی) اورنبرگ کے مقام پر طلب کی۔ اسمبلی نے آزاد باشکیر حکومت قائم کر دی۔ یہاں بھی کمیونسٹوں نے افتراق انگیز ہتھکنڈوں سے کام لیا۔ شریف منازوف نے ملّا وحیدوف کا کردار ادا کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سمیت کمیونسٹوں کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ سٹالن نے اس کی پشت پناہی کی۔ اور سنٹرل مسلم کمیساریٹ کا نائب صدر بنا دیا۔ فروری ۱۹۱۸ء میں کمیونسٹ حکومت نے زکی ولیدوف کو گرفتار کر لیا۔ مگر وہ انہیں جُل دے کر نکل گیا۔ وہ باشکیری فوج جمع کر کے امیر البحر کولچک کی سفید فوجوں سے جا ملا۔ کولچک اب بھی زاروں کے توسیع پسندانہ سامراج کا علمبردار تھا اس لئے زکی ولیدوف کو اس کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔ اس نے لینن اور سٹالن سے ملاقاتیں کیں۔ اور بعض یقین دہانیوں پر اعتماد کر کے معاہدہ طے کر لیا۔ اور باشکیری دستے سرخ افواج کے ساتھ جا ملے۔ لیکن چند روز بعد بھیڑیے نے بھیڑ کی وہ کھال اتار پھینکی جو اس نے باشکیری کو اپنی ہوس استعمار کا شکار بنانے کے لئے پہن لی تھی۔ پہلے ان لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا جنہیں کمیونسٹوں پر اعتماد نہ تھا اور جو ولیدوف کی پالیسی کے بھی مخالف تھے۔ پھر ولیدوف کے اپنے ساتھی یکے بعد دیگرے غائب ہونے لگے۔ خود زکی ولیدوف نے بھاگ کر اپنی جان بچائی اور

---

[1] روس میں مسلمان قومیں

بسماچی تحریک میں شامل ہو گیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو "باشکیریہ سوویٹ جمہوریہ" قائم کر دی گئی۔ باشکیری تاتاری، تاریخی اور ثقافتی اعتبار سے تاتاریوں ہی کا ایک حصہ تھے۔ ان کی زبان بھی ایک تھی۔ لیکن اس مصنوعی ریاست کے قیام سے کمیونسٹوں نے سہ گونہ فوائد حاصل کئے۔ تاتاریوں کی اس قوت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جو ایک ریاست کی صورت میں وجود پذیر ہو سکتی تھی۔ اس طرح ایک طرف جمہوریہ باشکیریہ اور دوسری طرف جمہوریہ تاتاریہ میں روسی آبادی کو جو ملک کی سیاسی اور معاشی زندگی پر چھائی ہوئی تھی تعداد کے لحاظ سے بھی برتری حاصل ہو گئی۔ تاتاری دونوں ریاستوں میں اقلیت بن گئے۔

تاتاری محکوم روسی مسلمانوں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور فکری و سیاسی رہنمائی ان کے ہاتھوں میں تھی ان کی اس قوت کو اس طرح غیر مؤثر کرنے کے بعد ان کی ثقافتی، فکری اور علمی اداروں پر ضرب کاری لگائی گئی۔ سائبیریا۔ یوکرین، قفقاز اور اورال میں تاتاری اخبارات، درسگاہیں اور دوسرے علمی اور ثقافتی ادارے بند کر دیے گئے۔ اس طرح روسی مسلمانوں کو سیاسی، فکری، تہذیبی اور ثقافتی رہنمائی سے محروم کر دیا گیا۔ اس اقدام سے تاتاری خود بھی بحیثیت قوم متاثر ہوئے۔ ان کی آبادیاں روس کے طول و عرض میں جا بجا پھیلی ہوئی تھیں۔ ان آبادیوں کا باہمی رابطہ تاتاری اخبارات اور درس گاہوں کے ذریعے قائم تھا۔ اب وہ روسی آبادی کے وسیع سمندر میں منتشر جزیرے بن کر رہ گئیں جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اس سمندر میں اٹھنے والا ابھار بھا ٹا جنہیں ہر آن اپنی لپیٹ میں لیتا جا رہا تھا۔

کمیونسٹوں نے تاتاریوں کو صرف دو ٹکڑوں ہی میں تقسیم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے اندر مزید تفریق

---

[1] میدانوں میں شکست کھانے کے بعد محاذ جنگ پہاڑوں میں منتقل ہو گیا جہاں حریت پسند گیارہ برس تک گوریلا جنگ لڑتے رہے۔ کمیونسٹ مسلمانوں کی اس جدوجہد آزادی کو بسماچی تحریک کے نام سے پکارتے ہیں۔ بسماچی، ترکی میں لیٹرے اور راہ زن کو کہتے ہیں۔ یہ ترکی لفظ بسمک سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ہیں دبانا، پامال کرنا۔ حملہ کرنا۔ حریت پسندوں کے لئے یہ کوئی نیا نام نہ تھا لینن اور سٹالن کے پیش رو زاران روس کے زمانے میں جب بھی حریت پسندوں نے پرچم آزادی لہرایا سامراجی حکومت نے انہیں بسماچی کے نام سے یاد کیا۔ یہاں تک کہ یہ لفظ ترکستانی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی علامت بن گیا ترکستانی اس نام پہ فخر اور اس تحریک کا ذکر بڑے شاندار الفاظ میں کرتے ہیں۔ اس تحریک کا آغاز فرغانہ سے ہوا۔ اور جلد ہی سارے وسط ایشیا میں پھیل گئی آزادی کی اس تحریک میں بلا استثنا، تمام قبائل نے حصہ لیا۔ (روس میں مسلمان قومیں ص ۱۴۹)

پیدا کی۔ جمہوریہ تاتاریہ میں تاتاری مسلمانوں کے دو قبیلوں مشار اور تفتیار کو باضابطہ نسلی گروہ تسلیم کرکے جداگانہ قومیت کا درجہ دے دیا۔ ان کے علاوہ کریشان اور نجیبک قبائل کو بھی آزادانہ حیثیت بخش دی۔ یہ دونوں گروہ نسلاً تاتاری تھے اور ان کے اجداد کو روسی زاروں نے جبراً عیسائی بنا لیا تھا۔ اس طرح مذہب دشمن نظام میں مذاہب کی بنیاد پر تاتاریوں میں اس لئے تفریق پیدا کی کہ وہ نسلی بنیادوں پر مجتمع ہو کر جمہوریہ تاتاریہ کی تقویت کا سبب نہ بنیں۔

تاتاریوں کو پھاڑنے کا مقصد جب پورا ہو گیا۔ ہر گروہ اپنی اپنی جگہ ایک مکمل یونٹ بن گیا۔ سیاسی۔ ثقافتی اور معاشی زندگی پر روسیوں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اور وہ غالب ترین عنصر کی حیثیت سے ہر وحدت میں پوری اجتماعی زندگی پر چھا گئے۔ تو روس میں ۱۹۳۰ء میں ان گروہوں کا جداگانہ وجود مٹا ڈالا۔ سرکاری کاغذات میں انہیں پھر سے تاتاری شمار کیا جانے لگا۔ اس طرح جداگانہ تشخص کا احساس و عصبیت مستقلاً پیدا کرکے اپنے خلاف متحدہ قومی موقف اختیار کرنے کے امکانات ختم کر دیئے۔[۲]

ان دونوں جمہوریتوں (تاتاریہ و باشکیریا) کی حدود سے باہر بھی کوئی دس لاکھ تاتاری و باشکیری مسلمان رہتے تھے اور ان کی آبادیوں میں ہزاروں مسجدیں موجود تھیں۔ مگر اب نہ وہ مسجدیں باقی ہیں اور نہ نمازی۔ رسالہ "بیراق شوق" نے ان مسلم آبادیوں کے اعداد و شمار یوں پیش کئے ہیں۔[۳]

نام علاقہ	مسلمانوں کی تعداد
اوفا	۱۷۴۵۸۱۳
قازان	۹۹۹۷۷۵
سمرسک	۱۱۷۳۴۳
وتیکا	۱۳۶۶۴۹
سمارا	۲۴۴۲۴۱
اورنبرگ	۴۴۹۹۲۵
بیرم	۷۶۸۵۴
نیزنی نورگرود	۱۷۰۰۰۰

۲؎ روس میں مسلمان قومیں ص ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۶، ۱۱۷ ۳؎ رسالہ بیراق شوق مطبوعہ اوربن شمارہ ۳، ۱۸۰ بابت ۱۹۲۱

مضمون ذاکر قادری نیر، رسالہ "قزل تاتارستان" قازان۔ شمارہ بابت ۱۰ جنوری ۱۹۲۱ بحوالہ سرخ اندھیروں میں ص ۱۵۲

ان کے علاوہ متعدد ایسے علاقے ہیں مثلاً استراخان اور تاماسک وغیرہ جن کے الگ الگ اعداد و شمار نہیں ملتے ان علاقوں میں تاتاری اور باشکیری مسلمانوں کی مجموعی تعداد جو سرکاری رجسٹروں میں درج ہے ۳۹ لاکھ ۳۹ ہزار ۶ سو تھی[۱] مگر اب ان میں کہیں اذان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

شمالی قفقاز

قفقاز سے مراد وہ علاقہ ہے جسے قدیم مؤرخین نے ماوراء توقاز لکھا ہے اور مروجہ تاریخوں میں اسے کوکیشیا اور کوہ قاف کہا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ اس کا جنوبی حصہ جمہوریہ آذربائیجان پر مشتمل ہے۔ اس کا شمالی علاقہ مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ ہے۔ جو موجودہ جمہوریہ داغستان (جو جمہوریہ روسیا کا ایک صوبہ ہے) اور بلاد چرکس (جو براہ راست ماسکو کے تحت ہے) پر مشتمل ہے۔ اس میں چرکس۔ گگن۔ انگوش۔ شیشان۔ داغستانی۔ نوگہ۔ قوچیہ اور بالقر قبائل بستے ہیں۔ شمالی قوقاز کا رقبہ ایک لاکھ ۶۶ ہزار ایک سو ۷۰ مربع میل ہے۔ اور آبادی ۱۹۵۹ء کی رپورٹ کے مطابق ایک کروڑ ۱۰ لاکھ ۲۰ ہزار ہے۔[۲]

شمالی قوقاز نے زار شاہی روس کے سامراجی عزائم کی سب سے زیادہ مزاحمت کی تھی۔ امام شامل کی ناکامی کے بعد یہ علاقہ اضطرابات اور ہنگاموں کی آماجگاہ بنا رہا۔ ۱۸۶۰ء، ۱۸۷۷ء اور ۱۹۰۵ء میں تو بڑے پیمانے پر ناکام بغاوتیں بھی ہوئیں۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب آیا تو یہاں کے حریت پسندوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اگرچہ مختصر ساجدید تعلیم یافتہ طبقہ روسی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے خود مختاری کا قائل تھا۔ تاہم اس کے اثرات نہایت محدود تھے۔ اصل قوت نقشبندی سلسلہ کی تحریک مریدیہ کے ہاتھ میں تھی اور وہ روسی تسلط سے مطلقاً آزاد ہو کر اسلامی حکومت قائم کرنے کی علمبردار تھی۔ شیخ منصور سے امام شامل کی عظیم جدوجہد تک اس تحریک نے اسی مقصد کے لئے عظیم الشان قربانیاں دی تھیں۔ ۱۹۱۷ء میں قفقاز کے قوم پرست رہنماؤں نے ولاڈی کفکاز کے مقام پر پہلی کانگریس منعقد کی جس میں روس کی عبوری حکومت کی حمایت میں قراردادیں منظور کی گئیں۔ طے پایا

۱؎ مضمون ذاکر قادری بحوالہ سرخ اندھیوں میں ص ۱۵۳ ۲؎ سرخ اندھیروں میں ص ۳۴

کر دوسری کانگریس داغستان میں منعقد ہوگی۔ لیکن علماء کے مخالفین نے اس سے اختلاف کیا۔ چنانچہ دوسری کانگریس بھی ولاڈی کفکازہی میں ہوئی۔ کوہستانی عوام کی یونین قائم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اعلان میں وضاحت کی گئی تھی کہ کوہستانی یونین روس ہی کا حصہ رہے گی۔ داغستان اور شیشان کے مسلم عوام نے اس حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے شیخ نجم الدین گوزنسکی کو اپنا امام منتخب کیا اور اسلامی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ شیخ اوزون حاجی اس ریاست کے نائب امام منتخب کئے گئے۔ داغستان کی حکومت نے ترکی اور جرمنی سے تعلقات استوار کرنے کے لئے اپنے وفود استنبول اور جرمنی بھیجے۔ لیکن یہ حکومتیں جنگ میں شکست کھانے کے بعد خود افراتفری کا شکار ہو رہی تھیں اس لئے کوئی فیصلہ نہ کر سکیں[1]۔

ادھر کمیونسٹ حکومت نے جو عبوری حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد خانہ جنگی سے دوچار ہو چکی تھیں اپنی قوت بڑھانے اور داغستانی مسلمانوں کی ہمدردی جیتنے کے لئے اس آزاد اسلامی مملکت کو تسلیم کر لیا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں جنرل دینیکن کی کمان میں سفید فوجوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ اہلِ داغستان نے اپنے زعماء کی قیادت میں حملہ آوروں کا سخت مقابلہ کیا۔ اسی اثنا میں سرخ افواج بھی بن بلائے مدد کو آپہنچیں۔ سفید فوجیں تو شکست کھا گئیں مگر داغستان اب سوشلسٹوں کے چنگل میں گرفتار ہو چکا تھا۔ سوویٹ فوج نے کچھ عرصے تک ولاڈی کفکاز کی قوم پرست حکومت اور داغستان کی اسلامی حکومت کا وجود گوارا کیا۔ جونہی خانہ جنگی کا زور ٹوٹا اور کمیونسٹ فاتح بن کر ابھرے ان دونوں حکومتوں کی بساط لپیٹ کر رکھ دی۔ ولاڈی کفکاز کی حکومت نے تو ہتھیار ڈال دیے لیکن داغستان نے شدید مقاومت کی۔ لیکن آخر کار شکست کھائی۔ بے شمار داغستانی کمیونسٹوں کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ بقیۃ السیف گرفتار کر لئے گئے۔ آزاد حکومت کے بعض ارکان جان بچا کر بھاگ نکلے۔ یورپ اور ترکی چلے گئے[2]۔

داغستان اور شیشان کے مسلمان عوام کو علماء کی قیادت سے بدظن کرنے اور ان کے اندر افتراق پیدا کرنے میں شیشانی ملا سلطان کمیونسٹوں کا آلہ کار رہا۔ اس نے دشمن کے خلاف قائم کردہ محاذ میں شگاف ڈالے اور مسلمانوں کو سوشلسٹ حکومت کے متعلق انتہائی خطرناک خوش فہمیوں میں مبتلا کیا۔

شمالی قفقاز کی آبادی بیس لاکھ تھی اور مختلف قبائل پر مشتمل تھی۔ شیشان۔ انگوش۔ کراشائی اور

---

[1] Islam in the Soviet Union P. 73, 74, 97,

[2] 97

بلکار کریمیا کے رہنے والے تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح گھومتے پھرتے یہاں آباد ہو گئے تھے۔ ان سب کا تاریخی پس منظر ایک تھا۔ داغستان کے آورز البتہ نسلاً الگ تھے۔ تاہم ان سب کو اسلام نے ملکی وحدت میں منسلک کر دیا تھا۔ بعض قبائل کی مقامی بولیاں بھی تھیں۔ مگر بھاری اکثریت کی زبان عربی تھی۔ جس نے ان سب کو لسانی وحدت میں پرو رکھا تھا۔ یہ قبائل آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی تھے مگر جب بھی ملی و دینی سطح پر کوئی قائد ابھرا اس کے پرچم تلے ایک دینی و تہذیبی وحدت بن گئے۔ مریدیہ تحریک نے ان قبائل کو عصبیتوں سے پاک کیا اور وہ سب مل کر عرصہ دراز تک دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر رہے۔ امام شامل کے پرچم قیادت تلے تو سب لوگ ایک زبردست سیاسی وحدت بن کر نمودار ہوئے اپنی اس دینی تہذیبی اور سیاسی وحدت کے بل پر انہوں نے روسی سامراج کے خلاف تاریخ کی طویل ترین جنگ لڑی۔ کمیونسٹوں نے ان کے اس وحدت کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

ابتدا میں قفقازکو دو جمہوریتوں میں تقسیم کیا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۱۹ء کو کوہستانی خود مختار جمہوریہ قائم کی گئی جس میں سات قبائل شامل تھے۔ کبردا۔ شیشان۔ انگوش۔ شرکاسی۔ آوگی۔ بلکار اور کراشائی[1]۔

اسی سال نومبر میں جمہوریہ داغستان وجود میں آئی۔ کوہستانی جمہوریہ ابتدا میں تجدد پسند دانشوروں کو مطمئن اور ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی جونہی اس علاقے پر کمیونسٹوں کی گرفت مضبوط ہوئی انہوں نے جمہوریہ کا تیا پانچا کر دیا۔ اس کی جگہ زبانوں کی بنیاد پر سات چھوٹی چھوٹی انتظامی وحدتیں قائم کیں۔ یہ زبانیں وہ تھیں جن کا حقیقت کی دنیا میں کوئی وجود نہ تھا اور جنہیں ۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان جنم دیا گیا[2]۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد شمالی قفقاز مندرجہ ذیل پانچ وحدتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

۱۔ داغستان

۲۔ شمالی اوستیا

۳۔ کبردین

۴۔ شرکس

۵۔ آوگی

اسی طرح قوقاز کے باقی ماندہ علاقے کو پہلے تین ٹکڑوں آذربائیجان، آرمینیا اور جارجیا میں تقسیم کیا۔ پھر آذربائیجان

---

[1] حوالہ سابق ص ۲۹،۲۸ [2] ایضاً

میں ایک نئی خود مختار ری پبلک نخیشوان اور ایک خود مختار صوبہ نگورنو کاراباخ قائم کر دیا۔ شمالی قفقاز کے بعض علاقے جارجیا میں شامل کر دیے[1]

۱۹۲۵ء میں کمیونسٹ لیڈروں کی طرف سے مذہب پر حملوں کا آغاز ہوا۔ اسی دوران ملحدین کی یونین کی تاسیس عمل میں لائی گئی۔ جس نے مذہبی گروہ بندی کے خلاف مؤثر پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ ائمہ دین کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا[1]

۱۹۲۵ء میں کمیونسٹ لیڈروں کی طرف سے مذہب پر حملوں کا آغاز ہوا۔ اسی دوران ملحدین کی یونین کی تاسیس عمل میں لائی گئی۔ جس نے مذہبی گروہ بندی کے خلاف مؤثر پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ ائمہ دین کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا اور کئی بزرگوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا جن میں سے حاجی محمد۔ حاجی علی بشمات جبیری۔ شیخ محمد امین۔ ابراہیم شیخ اور حاجی بلیال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شمالی قفقاز میں اسلام کی بیخ کنی کی مہم کئی تدریجی مراحل پر مشتمل تھی یہ تدریجی مراحل اختیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مہم کے دوران عام باشندوں کے ساتھ تصادم کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔

خلیل احمد حامدی نامور قفقازی مصنف کے اسلاموف کے مقالے "سٹالن اور مسئلہ اسلام" سے ان مراحل کا خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں:

پہلا مرحلہ۔ دینی کتابیں چھاپنے والے تمام مطابع ضبط کر لیے گئے اور دینی لٹریچر کی تقسیم ممنوع قرار دے دی گئی۔ عربی رسم الخط کو لاطینی رسم الخط میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ تمام لوگ جو دینی امور سر انجام دیتے تھے انہیں ناکارہ عناصر قرار دے کر ان سے شہری حقوق چھین لیے مزید برآں ان کو اقتصادی سزائیں دی گئیں۔

دوسرا مرحلہ۔ روس کی خفیہ پولیس نے علماء کو یہ بیانات دینے پر مجبور کیا۔ کہ مذہب ایک فراڈ ہے جس سے عوام کو بیوقوف بنانا مقصود ہے اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ آج کے بعد ہم مذہب کی خدمت نہیں کریں گے اور نہ ہم خدا کے قائل رہیں گے۔ ان بیانات پر چند علماء کے سوا جنہیں غیر معمولی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا کسی عالم نے دستخط نہیں کئے۔ چنانچہ خفیہ پولیس نے جس کے پاس غیر معمولی اختیارات تھے ان تمام ائمہ و علماء و مشائخ کو دور دراز مقامات میں جلاوطن کر دیا۔ جنہوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسجدیں اماموں

---

[1] سوویٹ انسائیکلو پیڈیا کلاں ۱۹۴۸ء باب سوویٹ روس کی یونین جمہوریتیں۔

اور خطیبوں سے خالی ہو گئیں۔ اور دینی مدرسے معلّمین اور اساتذہ سے یکسر محروم ہو گئے اور ان کی بجائے ایسے لوگوں کو یہ کام سونپے گئے جو ان سے نابلد تھے اور آخر کار خود انہیں بھی اسی انجام سے دوچار ہونا پڑا۔

تیسرا مرحلہ۔ سوویٹ گورنمنٹ نے تمام مساجد اور مذہبی مدرسوں کو ضبط کر لیا۔ اور انہیں دوسرے اداروں کے سپرد کر دیا[1]

۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے دو سال اشتراکی جبر و ستم کے مشہور سال ہیں۔ اشتراکی لیڈر ینیروف نے ان دو سالوں کے اندر بے پناہ خون ریزی کی اور عوامی کارروائیوں کے نام سے "عوام کے دشمنوں" کا خاتمہ کیا۔ ان کارروائیوں کے نتیجے میں شمالی قفقاز ایک لاکھ ۲۰ ہزار مردوں اور عورتوں سے محروم ہو گیا[2] ایک قفقازی مصنف کا بیان ہے کہ روسی حکومت نے کاراشی۔ شاشانی اور انگوشی اقوام کو فنا کرنے کے لیے ہر وحشیانہ طریقہ استعمال کیا۔ تقریباً دس لاکھ مسلمان فنا کے گھاٹ اتر گئے۔

جزیرہ نمائے قرم (کریمیا)

یہ سرسبز و شاداب علاقہ جزیرہ ترکی کے شمال میں بحر اسود میں واقع ہے۔ مغرب اور جنوب میں اسے بحر اسود نے گھیر رکھا ہے۔ اس کے مشرق میں کیرچ اور بحر ازوف ہے۔ جو اسے قوقاز سے جدا کرتا ہے اور شمال میں اس کی سرحدیں یوکرین سے ملتی ہیں۔ جزیرہ نمائے قرم کا رقبہ ۲۷ ہزار کیلو میٹر ہے۔ قرم کو انگریزی زبان میں کریمیا کہتے ہیں[3]

روس میں عبوری حکومت قائم ہوتے ہی کریمیا کے تاتاریوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۱۷ء کو سمفر پول کے مقام پر قومی کانفرنس منعقد کی جس میں مسلم مجلس عاملہ منتخب کی گئی۔ اسی روز مختلف سیاسی گروہوں نے مل کر ایک قومی جماعت "ملی فرقہ" تشکیل دی۔ اس میں دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں کے لوگ شریک تھے۔ دائیں بازو میں خالص قوم پرست بھی تھے اور کٹر دین پسند بھی۔ بائیں بازو میں قوم پرست، سوشلسٹ اور بالشویک (کمیونسٹ) تھے۔ اکتوبر میں بالشویکوں نے عبوری حکومت کا تختہ الٹ کر اپنی حکومت قائم کی تو کریمیا کے بالشویکوں نے

---

[1] سٹالن اور مذہب اسلام شائع شدہ مجلہ "آزاد قوقاز" میونخ شمارہ ۱ بابت اکتوبر ۱۹۵۱ء [2] اخبار روس شمارہ ۴ بابت ۱۹۶۰ء

[3] سرخ اندھیروں میں ص ۳۸

نے ملّی فرقہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اسی مہینے باغچی ساری میں تاتاری قوم پرستوں نے کورلتائی طلب کی اور نومبر ۱۹۱۷ء میں جمہوریہ کریمیا وجود میں آگئی جس کے صدر کریمیا کے مفتیِ اعظم چلبی جہان منتخب ہوئے۔ فوراً ہی پولینڈ اور کریمیا کے درمیان سفارتی سطح پر روابط قائم ہو گئے۔ بعض دوسری حکومتوں نے بھی اسے تسلیم کر لیا لیکن آزاد کریمیا کی زندگی نہایت مختصر تھی۔ ۱۳ر جنوری ۱۹۱۸ء کو بحرِ اسود میں متعین بحری بیڑے کے تین ہزار سپاہی آزاد حکومت کے دارالحکومت سمفرپول کی طرف بڑھے۔ سیوستوپول کے روسی مزدوروں نے ان کا ساتھ دیا۔ سوران نامی ایک گاؤں کے قریب مختصر سی تاتاری فوج نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ زبردست جنگ کے بعد تاتاریوں کو شکست ہوئی۔ ۱۴ر جنوری کو سرخ فوجوں نے سمفرپول فتح کر لیا۔ آزاد کریمیا کی اسمبلی (کورلتائی) توڑ دی گئی۔ اکثر قوم پرست لیڈر بھاگ کر پہاڑوں میں پہنچ گئے جہاں انہوں نے کشمکش جاری رکھی۔ آزاد حکومت کے سربراہ گرفتار کر لئے گئے۔ اور روسی بحریہ نے اسے قتل کر دیا۔[1]

بالشویکوں نے قرم کے ایک اشتراکیت نواز لیڈر ولی ابراہیم کو قرم کا گورنر مقرر کیا۔ سٹالن نے قرم کے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے یہ تجویز کی کہ جزیرہ سے مسلمانوں کو نکال کر دوسرے علاقوں میں آباد کر دیا جائے ولی ابراہیم نے اس تجویز کی مخالفت کی چنانچہ اسے ۱۹۲۷ء میں مختلف فرضی الزامات لگا کر تختہ دار پر لٹکا دیا۔ ولی ابراہیم نے تختۂ دار پر چڑھ کر جلادوں سے کہا:

"جب ریچھ اپنے بچے کو پھاڑ کر کھانا چاہتا ہے تو اسے خاک میں آلودہ کر دیتا ہے تاکہ وہ یہ سمجھے کہ یہ میرا بچہ نہیں ہے۔"[2]

ولی ابراہیم کے ساتھ کریمیا کی تین ہزار پانچ سو نمایاں ترکمانی شخصیتوں کو بھی موت، نظربندی اور جلاوطنی کی سزائیں دی گئیں۔ ان سب کے خلاف الزام یہ تھا کہ ان کے اندر درمیانہ طبقہ کے وطن پرستانہ رجحانات پائے جاتے ہیں۔[3]

مذہب کے بارے میں کمیونسٹوں نے یہاں جو رویہ اختیار کیا اسے ہم دو مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں جو ۱۹۲۱ء کے موسم خزاں سے شروع ہوتا ہے۔ اور ۱۹۲۸ء کے موسم بہار پر ختم ہوتا ہے۔ کمیونسٹوں نے کوشش

P. 66, 67

[1] سرخ اندھیرے میں ص ۱۳۵، ۱۳۶

[2] مجلہ امور روس میونخ شمارہ ۴۷ - ۱۹۶۰ء مضمون جزیرہ نمائے قرم میں اسلام کی سرگزشت۔

کہ قرم کو روسیوں کا علاقہ بنایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اصل آبادی کو اکھاڑنے اور روسی اقوام کو اس کی جگہ آباد کرنے کی اسکیم نافذ کی۔ اس مرحلے میں کمیونسٹوں نے اپنے سیاسی مخالفین کی سرکوبی کی۔ مگر مذہب کے بارے میں سخت گیرانہ پالیسی اختیار نہیں کی۔ مسلمان اپنے مذہبی فرائض کو حسب منشا انجام دیتے تھے۔ مسجدیں اور عبادت گاہیں کھلی تھیں شہروں اور بستیوں میں مذہبی جماعتیں موجود تھیں۔ کریمیا کے مرکزی شہر سمفرپول میں ادارۂ اسلامی مرکز تھا علماء کی تنخواہیں اور دوسرے مصارف عوام الناس خود برداشت کرتے تھے۔ ترکمانی اور تاتاری آبادیوں کے اندر جگہ جگہ مسجدیں اور دینی مدرسے موجود تھے۔ نکاح و طلاق اور شخصی قوانین کے دوسرے تمام شعبے مسلمان اپنی شریعت کے مطابق سرانجام دیتے تھے۔ بچوں کو ایمان اور اخلاق اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی احکام و آداب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جمعہ کے دن عام تعطیل کا دن تھا۔ مسلمانوں کو یہ خصوصی رعایت حاصل تھی کہ وہ روسی ترانے کے دوران سر سے قلپاق (کھال کی ٹوپی جسے ترکمانی مسلمان اوڑھا کرتے تھے) اتارنے کے پابند نہیں حالاں کہ دوسری اتمام اقوام پر لازم تھا کہ جب روسی ترانہ گایا جا رہا ہو تو وہ سرپوش اتار دیں۔ اور ننگے سر کھڑے ہوں مسلمانوں کو خصوصی رعایت دینے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ مسلمان نماز کے دوران بھی سر سے ٹوپی نہیں اتارتے۔ حالاں کہ نماز مسلمانوں کا سب سے اہم مقدس اور قابلِ احترام فعل ہے۔[1]

دوسرا مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب ۱۹۲۹ء میں بالشویکوں نے قرمی آبادی کے انخلاء کا فیصلہ کیا۔ اور قرم کے مقامی کمیونسٹوں نے اس کی مخالفت کی۔ بالشویکوں نے پہلے مقامی کمیونسٹوں کو ختم کیا۔ اور پھر خود ہی اسلام کے خلاف اپنی تلوار کو بے نیام کر دیا۔ کمیونسٹوں نے ترکمانی قوم کے ملی اور قومی حقوق منسوخ کر دیئے۔ مذہبی مراسم کے بارے میں اعلان کر دیا گیا کہ یہ کام درمیانہ طبقہ کی قوت کا باعث اور سرخ انقلاب کے منافی ہے۔ اور نہ صرف پروپیگنڈے کے ذریعے سے مذہب کا دائرہ سیکڑنے کی کوشش کی گئی بلکہ حکومت کے تمام وسائل، کمیونسٹ پارٹی کی پوری قوت اور خفیہ پولیس کو مذہب کے خاتمے کے لئے وقف کر دیا گیا۔ لوگوں کو کھلم کھلا ترکِ مذہب پر مجبور کیا گیا۔ علماء اور دیندار طبقے کے ساتھ تشدد اور سخت گیری کا برتاؤ کیا گیا۔[2]

مذہب پر حملہ شروع ہوا تو سب سے پہلے مسجدیں اس کا نشانہ بنیں چنانچہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت علاقے کی

[1] سرخ اندھیروں میں ص ۱۳۰، ۱۳۸ [2] مجلہ دینی ملی یول شمارہ ۱، بابت ۱۹۳۰ء مضمون "روس میں مذہبی استحصال کے خلاف رومانیہ کا احتجاج۔"

مسجدوں کو منہدم کر دیا گیا۔ اور کلبوں یا گوداموں کے مصرف میں لایا گیا، حتیٰ کہ بعض مساجد سے سینما گھروں کا کام لیا گیا ۱۹۳۲ء میں شکست و ریخت کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ شہروں اور قصبوں کے اندر چند ایک عبادت گاہوں کو چھوڑ کر نہ کوئی مسجد رہی نہ کلیسا نہ صومعہ[1]۔

ایک روسی مصنف برنوف لکھتا ہے :۔

باکیشاری مسلمانوں کا مذہبی گڑھ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں اس شہر کی ۳۲ مسجدوں میں سے صرف تین مسجدیں باقی رہ گئیں[2]۔

آذربائیجان

آذربائیجان کے مشرق میں بحر خزر (بحر قزوین) ہے۔ شمال میں قوقاز کا پہاڑی سلسلہ اور جارجیا ہے مغرب میں آرمینیا۔ ترکی اور عراق ہیں۔ اور جنوب میں ایران سے سرحدیں ملتی ہیں۔ آذربائیجان کا مجموعی رقبہ ۱۹۴ ہزار کلومیٹر ہے۔ اس کا شمالی حصہ سوویٹ وفاق میں شامل ہے اور جنوبی حصہ ایران کے اندر واقع ہے۔ شمالی آذربائیجان (یعنی روسی حصے) کا رقبہ ۹۰ ہزار کلومیٹر ہے۔ اور اس کی آبادی ۴۰ لاکھ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد ۸۰ فیصد ہے اور بقیہ ۲۰ فیصد روسی اقوام ہیں۔ ایران۔ ترکی اور آذربائیجان کے درمیان نسل، تاریخ۔ زبان اور تہذیب و ثقافت کے گہرے رشتے پائے جاتے ہیں[3]۔

۱۹۰۵ء تک روس اور روس کے مقبوضہ ممالک میں سیاسی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ۱۹۰۵ء کے ناکام انقلاب کا ایک ثمرہ یہ تھا کہ زار نے سیاسی جماعتیں قائم کرنے اور سیاسی کام کھلے عام کرنے کی اجازت دے دی۔ ۱۹۱۱ء میں محمد امین رسول زادہ نے حزب مساوات تشکیل دی۔ مارچ ۱۹۱۷ء کی جمہوری حکومت کے بعد حزب مساوات نے تحریک آزادی شروع کر دی۔ باکو (آذربائیجان کا دار الحکومت) کی آبادی روسیوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے ایک کمیونسٹ انقلابی کونسل قائم کر لی جس کا سربراہ ایک آرمینی سٹیپن شاؤمیان تھا۔ حریت پسندوں نے غانزہ کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۱۷ء کو جمہوریہ آذربائیجان نے ماورائے قفقاز کی وفاقی جمہوریہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ مگر نو مہینے بعد اختلافات کی بنا پر الگ ہو گئی۔ اور آزادی کامل کا اعلان کر دیا۔ ۳ جون ۱۹۱۸ء کو ترکی کے ساتھ معاہدہ امن طے ہوا۔ پھر ترکی اور آذربائیجان کی مشترکہ فوجوں نے نوری پاشا

---

[1] مجلہ امور روس [2] جزیرہ نمائے قرم کی گائیڈ بک مطبوعہ ماسکو ۱۹۳۵ء، ص ۸۶ [3] سرخ اندھیروں میں ص ۳۰، ۳۱

کی قیادت میں باکو پر یلغار کی۔ ادھر برطانوی افواج جنرل ڈینسٹرویلی کی کمان میں سمندر کی طرف سے بڑھیں۔ اور ۱۷ اگست ۱۹۱۸ء کو باکو روسی فوجوں سے چھین لیا۔ تین دن بعد فتح علی خان خویار کی سربراہی میں آذربائیجانی حکومت قائم ہو گئی۔ ۷ دسمبر ۱۹۱۸ء کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر دستور ساز اسمبلی کے لئے عام انتخابات ہوئے ۱۲۵ میں سے ۴۰ نشستوں پر حزب مساوات کامیاب ہوئی۔ علی مردان توپچی باشی اسمبلی کا سپیکر منتخب ہوا۔ اور نصیب ازبک نے نئی حکومت بنائی۔ جسے اتحادی طاقتوں نے تسلیم کر لیا۔ ۲۷ اپریل ۱۹۲۰ء کو آذربائیجان پر سرخ افواج نے ہلہ بول دیا۔ کہا گیا کہ یہ اقدام آذربائیجان کی مجلس انقلاب کی استدعا پر کیا گیا۔ لیکن در حقیقت یہ کھلی سامراجی جارحیت تھی جس کا ارتکاب کمیونسٹوں نے تیل کے چشموں پر قبضہ کرنے کے لئے کیا۔

باکو میں مارچ ہی سے مسلمانوں اور کمیونسٹوں کے درمیان تصادم شروع ہو گئے تھے۔ کمیونسٹوں کے ساتھ سوشلسٹ انقلابی، آرمینی ملیشیا اور چند مسلمان جو کمیونسٹ پارٹی ہمت سے تعلق رکھتے تھے۔ سرخ افواج انہی کی سازباز سے حملہ آور ہوئی تھیں۔ ہولناک جنگ کے بعد مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ باکو میں تین دن تک مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا جس میں تین ہزار سے زائد مسلمان مارے گئے۔ اور آذربائیجان کی آزاد زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ اور سوویٹ جمہوریہ وجود میں آگئی[1]۔

آذربائیجان پر قبضہ کرنے کے بعد کمیونسٹوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اوقاف کو ضبط کر لیا۔ اس طرح ادارہ اسلامی مالی لحاظ سے بے بس ہو کر رہ گیا۔ اور اسے وہ تمام علمی اور دینی مدرسے بند کرنے پڑے جو مدتوں سے اس نگرانی اور کفالت میں چلے آرہے تھے۔ شرعی قانون کو بیک قلم منسوخ کر دیا گیا۔ معلمین پر یہاں تک پابندی لگا دی گئی کہ وہ بچوں کو اسلام کی مبادیات کی تعلیم بھی نہیں دے سکتے تھے۔ علماء اور نمایاں مذہبی شخصیتوں، مؤذنوں، خطیبوں اور معلمین کو شہری حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ مساجد کو بلدیاتی محکموں کے تابع کر دیا گیا۔ اور بلدیاتی محکموں پر یہ قانون نافذ کیا گیا کہ وہ منظم مذہبی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اماموں اور خطیبوں کو غیر محنت کش طبقہ قرار دے کر ان پر بھاری ٹیکس عائد کر دیے جن کی ادائیگی ان کی ہمت سے باہر تھی[2]۔

---

[1] P. 81: 86, 93, 97 [2] مجلہ امور روس میونخ شمارہ ۴۔ ۱۹۶۰ء

اسلام پر حملے کا آغاز اس اقدام سے کیا گیا کہ آذربائیجان میں عربی رسم الخط کا استعمال ممنوع قرار دے دیا گیا۔ حالاں کہ یہ رسم الخط قدیم زمانے سے آذربائیجان میں رائج چلا آرہا تھا۔ عربی رسم الخط پر پابندی لگا دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ نسل کا تعلق اپنے ماضی سے منقطع ہوگیا۔ اور وہ اپنے قدیم مذہبی اور ملی سرمائے سے ناآشنا ہوگئی چنانچہ خلاف اسلام نظریات اور غیر دینی سرگرمیوں کو پنپنے کا موقعہ فراہم ہوگیا۔ تعلیمی میدان میں تطہیر کی منظم مہم چلائی گئی۔ علماء اور دینیات کے اساتذہ کو چن چن کر نکالا گیا[۱]۔

جدید اقتصادی پالیسی کے نفاذ پر آذربائیجان کے پریس نے علماء کے خلاف پروپیگنڈہ کا طوفان برپا کر دیا ان کے خلاف نہایت لچر مضامین لکھے گئے۔ اشعار میں ان کی تضحیک کی گئی۔ تصویروں اور کارٹونوں میں ان کی پگڑی اچھالی گئی۔ انہیں طفیلی، مفت خورے اور انقلاب دشمن کہا گیا۔ تھیٹروں میں ان کے خلاف ڈرامے اسٹیج کیے گئے۔ مزدور یونینوں کی طرف سے یہ قراردادیں پاس کرائی گئیں کہ مسجدیں بند کر دی جائیں اور انقلاب دشمن مولویوں کو بے نقاب کیا جائے۔ ۱۹۲۴ء سے پہلے دین کے خلاف پروپیگنڈا مہم غیر منظم تھی مگر ۱۹۲۴ء کے بعد اسے منظم کیا گیا۔ اسی عرصے میں الحادی انجمن بھی ظہور پذیر ہوگئی۔ اخبار باکنسکی رابوچی کے بیان کے مطابق اس انجمن کے مقاصد یہ تھے۔ مزدوروں اور کسانوں کو الحادی پرچم کے نیچے جمع کرنا۔ محنت کش طبقے کو مذہب کی افیون سے نجات دلانا۔ طبیعات کی بنیادوں پر مادی عقائد کی تعمیر کرنا[۲]۔

آذربائیجان کی تاریخ میں یہ ثبت ہو چکا ہے کہ روسی لیڈر بیریوف کے عہد استبداد (۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۸ء) کے دوران صرف آذربائیجان میں ایک لاکھ بیس ہزار صرف تعلیم یافتہ اشخاص قتل کیے گئے[۳]۔

قازقستان

قازقستان ترکستان ہی کا ایک حصہ تھا۔ لیکن زارِ شاہی روس نے اسے ترکستان سے فکری و تہذیبی طور پر کاٹ دینے کی ہر ممکن تدبیر کی۔ حتیٰ کہ جو امور روس کے دوسرے مقبوضہ مسلمان علاقوں میں ممنوع اور بغاوت کے مترادف تھے یہاں ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ زارانِ روس کی یہ پالیسی بڑی حد تک کامیاب رہی۔

---

۱ روزنامہ باکنسکی رابوچی باکو ۱۲ ستمبر ۱۹۲۶ء ۲ ایضاً ۱۴ اپریل ۱۹۲۵ء

۳ دیکھئے کتاب "سٹالن کے پیش نظر کون ہے"۔ تالیف اورالوف مطبوعہ پیرس، ۱۹۵۷ء ص ۱۶۱ تا ۱۷۱ بحوالہ روس میں مسلمان قومیں۔

قازقستان کے دانشورانِ ملی، فکری، سیاسی تحریکوں سے الگ تھلگ رہے جو دوسرے مقبوضہ علاقوں میں جاری تھیں۔ تاہم ۱۹۱۶ء میں قازقوں کی بغاوت نے جو جبری فوجی بھرتی کی وجہ سے شروع ہوئی تھی صورت حال بدل ڈالی۔ قومی احساسات نے ایک نیا اور شدید رنگ اختیار کر لیا۔

مارچ ۱۹۱۷ء میں الش اوردہ (Hord of Alash) نامی ایک سیاسی جماعت وجود میں آگئی۔ یہ لوگ کیمیا کی سیاسی جماعت ملی فرقہ کے برعکس دائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم دین و سیاست کی تفریق کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنا زرعی اور اقتصادی پروگرام بائیں بازو کی جماعتوں سے اخذ کیا تھا۔ جولائی ۱۹۱۷ء میں الش اوردہ نے خودمختار قازق ریاست قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ جلد ہی ایک اور سیاسی جماعت بِرلِک توفی (Flag of Union) میدان میں آگئی۔ یہ جماعت دین پسند اور بین الاسلامی تحریک اخوت (Pan Islamism) کی علمبردار تھی۔ اس کا زور ترکستان سے متصل صوبہ سیر دریا میں تھا جو دین پسند قازق قبائل کا مسکن تھا۔ دوسری جماعت اُش ژوز (The thre Hordes) تھی۔ یہ بھی مذہبی ذہن رکھنے والوں پر مشتمل تھی اور پان اسلام ازم کی حامی تھی۔ آگے چل کر اس جماعت کے رہنما کمیونسٹوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر ان کا آلۂ کار بن گئے۔ روسی مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے۔ کہ ان کی مختلف جماعتیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ اور اغیار پر اعتماد کرتی تھیں خصوصاً بعض نام نہاد مذہبی رہنماؤں نے ٹھیک وہی کردار ادا کیا جو ہمارے ہاں اسلام اور سوشلزم کی کھلی کشمکش میں بعض نام نہاد علماء نے ادا کیا۔ اُش ژوز کے مذہب پسند رہنما الش اوردہ کے اس لئے مخالف تھے کہ وہ آزاد خیال تھے۔ لیکن کمیونسٹوں سے جو خدا اور رسول کے کھلے منکر اور نسلاً یہودی تھے۔ رشتۂ اتحاد استوار کرنے میں ان کی دینی غیرت ذرا بھی آڑے نہ آئی۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں سرخ فوجوں نے ایدل اور سائبیریا کی طرف سے حملہ کر دیا۔ اش ژوز کے ملاؤں نے اندر سے نقب لگائی۔ یکے بعد دیگرے تمام شہروں پر سرخ افواج قابض ہوگئیں ۴ مارچ تک قازقستان ان کے چنگل میں گرفتار ہو چکا تھا۔

ترکستان

ترکستان کا خطہ عظیم اس وقت دو حصوں میں بٹ چکا ہے مغربی حصہ جسے روسی ترکستان بھی کہا جاتا ہے اور مغربی ترکستان بھی، روس کے اندر شامل ہے اور مشرقی حصہ جسے چینی ترکستان کا نام بھی دیا جاتا ہے

اور سنکیانگ ابھی چین کے قبضے میں ہے۔ روسی ترکستان دراصل ثقافت، تاریخ، مذہب اور جغرافیائی حیثیت کے لحاظ سے ایک ہی خطہ تھا۔ جس میں ترک قومیں آباد تھیں۔ مؤرخین اسلام نے اسے ترکستان بھی لکھا ہے اور ماوراء النہر بھی۔ آمو دریا (دریائے جیحوں) کے اس پار کا علاقہ ماوراءالنہر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آمو دریا کے شمال میں سیر دریا (دریائے سیحون) بہتا ہے یہ پورا دوآبہ ماوراءالنہر ہی کہلاتا ہے۔ مسلمانوں کے تاریخی مراکز بخارا، سمرقند، خیوا اور خوقند اسی دوآبے میں واقع ہیں۔ ائمہ اسلام بخاری۔ ترمذی۔ زمخشری۔ سرخسی اور فلاسفۂ عظام فارابی و ابن سینا وغیرہ اسی علاقے کے اندر محوِ خواب ہیں[1]

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں مغربی ترکستان کا پورا علاقہ زارِ شاہی روس میں داخل ہو چکا ہے۔ زاروں نے انتظامی اور سیاسی اعتبار سے ترکستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک وہ جو براہ راست روس کے زیرِ انتظام تھا اور دیگر استعماری مقبوضات کی طرح روس کا ایک داخلی صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ تاشقند اس صوبے کا دارالحکومت تھا۔ دوسرا وہ جو بخارا اور خیوا کی ریاستوں پر مشتمل تھا جہاں امیر حکمرانی کرتے تھے۔

مارچ ۱۹۱۷ء میں روس میں عبوری حکومت قائم ہوئی تو ترکستان میں افراتفری کی کیفیت تھی۔ روسی جنہوں نے گزشتہ ستره برس سے ترکستان میں لُٹس مچا رکھی تھی اب ان قانونی بندشوں سے بھی آزاد ہو گئے جو روسی حکومت نے ان پر عائد کر رکھی تھیں۔ اب عوامی حکومت کا دورِ دورہ تھا۔ کسانوں، مزدوروں اور فوجی سپاہیوں نے ہر جگہ سوویٹ قائم کر لئے تھے اور لوگوں کو مختلف بہانوں سے لوٹ رہے تھے۔

مسلمانوں میں کئی جماعتیں سرگرم عمل تھیں ایک تو ترکستان ملی کمیٹی تھی دوسری شورائیہ اسلامیہ اور تیسری نوجوان ترکستان یا جدید پارٹی تھی۔ جو ترکستان کی سیاسی خود مختاری، بخارا اور خیوا کی ریاستوں کے خاتمے اور اسلام کو جدید رنگ میں رنگنے کی علمبردار تھی۔ یہ سب جماعتیں ایک دوسرے سے متصادم تھیں۔

مصطفےٰ چوکائی لکھتے ہیں:۔

"اس وقت ہم میں کئی پارٹیاں موجود تھیں۔ ہر پارٹی اپنے آپ کو مستقل حیثیت کا مالک اور ترکستان کی واحد نمائندہ اور ترجمان سمجھتی تھی۔ یہ پارٹیاں مختلف سیاسی رجحانات

---

[1] سرخ اندھیروں میں ص ۱۵، ۱۶

پروگرام اور لائحہ عمل کی بنیاد پر نہیں بلکہ شخصیتوں کی بنیاد پر وجود میں آئی تھیں یہ حالت ہمارے لئے کسی طرح بھی خوش آئند نتائج اپنے دامن میں نہ رکھتی تھی"

اس افتراق کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاشقند کانفرنس (منعقدہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۷ء) میں مسلمان کوئی متحدہ موقف اختیار نہ کر سکے۔ تاشقند سوویٹ جو سب کی سب روسیوں پر مشتمل تھی اور ان روسیوں کی اکثریت سوشل انقلابی پارٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ ترکستانی مسلمانوں کو نئی حکومت میں حصہ دار بنانے کے لئے بالکل آمادہ نہ تھی۔ اس کے ایک لیڈر نے تاشقند میں اعلان کیا۔

"انقلاب روسی مزدور اور فوج لائے ہیں۔ اس لئے انقلاب کی رہنمائی بھی وہی کریں گے۔ ترکستانیوں کو وہ جو کچھ دیں گے اس پر انہیں قناعت کرنا ہوگی"

یہ سوشلسٹ انقلابیوں ہی کا نقطۂ نظر نہ تھا۔ سبھی روسیوں کا اندازِ فکر یہی تھا۔ مصطفےٰ چوکائی کے الفاظ میں۔

"کانفرنس میں آئے ہوئے روسی خواہ وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتے تھے سب کی باتوں سے اس اعلان کی تائید ہوتی تھی لیکن وہ انقلابی نزاکتوں کے پیش نظر اپنے مافی الضمیر کو بڑی احتیاط کے ساتھ ادا کرتے تھے"

روس کی اس روش کے نتیجے میں مسلمانوں میں مشترکہ پلیٹ فارم کا احساس پیدا ہوا۔ تاشقند ہی میں کل ترکستان مسلم کانگرس منعقد ہوئی جس نے روس میں وفاقی نظام قائم کرنے اور روسی آباد کاروں کو ملک کے حقیقی باشندوں کی زمینوں سے بے دخل کرنے کی قراردادیں منظور کیں۔ اور مسلمانوں کے تمام گروہ ملی شوریٰ میں مدغم ہو گئے۔ ہر صوبے میں اس کی شاخیں وجود میں آگئیں۔ مرکزی ملی شوریٰ کے لئے ہر صوبے سے ایک ایک نمائندہ لیا گیا مصطفےٰ چوکائی صدر منتخب ہوئے۔ اس طرح مسلمانوں کی متحدہ قوت ابھر کر سامنے آگئی۔

روس کی عبوری حکومت میں شامل یوں تو ساری جماعتیں مسلمانوں کے مطالبات کی شدید مخالف تھیں مگر سوشل انقلابیوں کا رویہ سخت معاندانہ تھا۔ اس صورت حال سے کمیونسٹوں نے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا اور اس ہمدردی کے پردے میں اپنے افکار و تصورات کے جراثیم ان کے اندر پھیلائے۔ چنانچہ مختلف مقامات پر مزدوروں اور محنت کشوں میں اپنے چھوٹے چھوٹے گروپ وجود میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان گروہوں سے آگے چل کر انہوں نے ترکستان کو اپنے عزائم کا شکار بنانے میں بڑا کام لیا[1]

---

[1] Islam in the Soviet Union OP Cit. P. 72

خوقند کی آزاد ریاست کا خاتمہ

سوویٹ حکومت نے اعلان انقلاب جاری کیا تو دسمبر ۱۹۱۷ء میں مرکزی ملی شوریٰ نے خوقند میں قومی کانفرنس منعقد کی جس میں دو سو مندوبین شریک ہوئے۔ کانفرنس کا ایک گروپ چاہتا تھا کہ مکمل آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔ دوسرے گروپ کی رائے تھی کہ ہمیں روسیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تدبر اور احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ کانفرنس نے طے کیا کہ تاشقند سوویٹ سے ترکستان کی خود اختیاری منوانے کے لئے مذاکرات کئے جائیں۔ تاشقند سوویٹ کی اکثریت سوشل انقلابیوں پر مشتمل تھی۔ جو ترکستان کو خود مختاری دینے کے سخت مخالف تھے۔ بایں ہمہ ۱۱ر دسمبر کو خوقند کانفرنس نے ترکستان کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ قدیم خوقند دارالحکومت قرار پایا۔ پہلے دانش بے اولی سربراہ مملکت منتخب ہوئے۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں اقتصادی بحران پیدا ہوا تو انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اور مصطفےٰ چوقائی صدر بنے۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو مسلمانانِ تاشقند نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ تاشقند کی سوویٹ حکومت کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا۔ مسلمانوں کے جذبات نہایت شدید تھے۔ اور توقع تھی کہ تاشقند حکومت کا تختہ الٹ جائے گا۔ مگر مظاہرین محض جوش و جذبہ کا اظہار کر کے منتشر ہو گئے۔

۲۴ر جنوری کو خوقند نے ترکستان دستور ساز اسمبلی طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس میں ترکستان کے ہر ضلع کو نمائندگی دینے کا اعلان کیا۔ تمام عوام کی مساوات کی مدعی سوویٹ حکومت نے مسلمانوں کو نمائندگی اور مناصب دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن خوقند کی حکومت نے غیر مسلم آبادی کے لئے دستور ساز اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں مختص کر دیں۔ اور وعدہ کیا کہ اسمبلی قوانین بناتے وقت اقلیتوں اور محنت کش عوام کے حقوق کا پوری طرح خیال رکھے گی۔[۱]

اسی مہینے ترکستان کے مزدوروں اور کسانوں کی کانگریس خوقند میں منعقد ہوئی جس نے ترکستان کی خود مختاری کی تائید و حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر ایک بار پھر پیٹرو گراڈ (جہاں اب کمیونسٹ برسر اقتدار آ گئے تھے) سے درخواست کی کہ وہ خود مختار ترکستان کی عبوری حکومت کو تسلیم کرے اور تاشقند سوویٹ کو توڑ دیں۔ جو مقامی باشندوں کے معاند غیر ملکی باشندوں پر اعتماد کرتی ہے۔ اور انقلاب اکتوبر کے اعلان میں تصریح کردہ اصلِ حق خود اختیاری کی خلاف ورزی پر قائم کی گئی ہے۔ پیٹرو گراڈ کا رویہ نہ صرف عجیب و غریب تھا

۱ (Svobodry Turkestan January 24 (1918)

بلکہ شلسٹ حکومت کی سامراجی روح کی غمازی بھی کرتا تھا۔ مطالبہ ماننے کی بجائے اس نے خوقند کی آزاد حکومت کو تاشقند سوویٹ سے لڑانے اور اس طرح خوقند حکومت کے خلاف لشکر کشی کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سوویٹ حکومت کی طرف سے قومیتوں کے کمیسار سٹالن نے لکھا۔

> "علاقائی سوویٹ حکومتیں اپنے داخلی معاملات میں خود مختار ہیں۔ اور اپنی حقیقی طاقت پر انحصار کر کے اپنے فرائض سر انجام دیتی ہیں۔ اس لئے ترکستان کے ملکی پرولتاریوں کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ مرکزی حکومت کو درخواست بھیجیں اور عوامی کمیساروں کی ترکستانی کونسل کو توڑ دینے کی اپیل کریں۔ جو ان کی رائے میں غیر مسلم فوجی عناصر پر اعتماد کر رہی ہے۔ بلکہ اگر ملکی پرولتاریوں اور کسانوں کے پاس طاقت ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ اس حکومت کو بزور تیغ ختم کر دیں"۔[۱]

ماسکو کی کمیونسٹ حکومت نے خوقند کے حق خود اختیاری کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ خوقند کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے اتحادیوں اور فوج کی ضرورت تھی۔ فوج روپے سے قائم ہو سکتی تھی۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں حکومت نے قرضہ جاری کیا۔ قرضہ پانچ دن کے اندر اندر مل گیا لیکن ہتھیار دینے پر کوئی آمادہ نہ ہوا۔ تاشقند کی کمیونسٹ پارٹی نے خوقند کے خلاف ماسکو سے مدد طلب کی۔ تاشقند سے کولی سوف فوج لے کر نکلا۔ ادھر اورنبرگ محاذ سے سرخ افواج شاہ پسند افواج کی قوت توڑ کر خوقند کی طرف بڑھیں۔ خوقند کے نئے شہر کے ریڈ گارڈز بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ ۱۴ر فروری ۱۹۱۸ء کو دارالحکومت کا محاصرہ کر لیا گیا۔

خوقند کی فوج اگرچہ تھوڑی اور بے سرو سامان تھی تاہم اس نے چار دن تک مقابلہ کیا۔ آخر شدید جنگ کے بعد روسی افواج نے خوقند پر قبضہ کر لیا۔ کمیونسٹوں نے تین دن تک شہر میں قتل و خون ریزی اور لوٹ مار کا بازار گرم کئے رکھا۔ اس قتلِ عام میں کتنے لوگ مارے گئے آج تک صحیح جواب نہیں مل سکا۔ ایک اندازے کے مطابق چودہ ہزار آدمی مارے گئے۔[۲]

۱ Vadim Chaikan, K. Istorii Rossus Koi Revolivtsu, Vol. 1. Kazn Bakinskikh Kommissarov Moscow (199) P. 139

۲ Colonel P.T Etherton in the Heart of Asia London (1925) P. 154

کمیونسٹوں نے قتل و غارت ہی پر اکتفانہ کیا بلکہ پورے علاقے میں فوجی ضرورت کے نام پر خوراک کے ذخائر بھی ضبط کرلئے۔ اور غلے کی درآمد پر پابندی لگادی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا علاقہ قحط کی لپیٹ میں آگیا۔ اور پچیس سے پچاس فیصد تک آبادی ہلاک ہو گئی۔ چینی ترکستان میں متعین برطانوی کونسل کرنل پی۔ ٹی۔ اتھرٹن نے لکھا۔

"دو لاکھ اشخاص اس قحط کا شکار ہو گئے۔ اور ہزاروں نے بھاگ کر چینی ترکستان میں پناہ لی"۔[۱]

رچرڈ پائپس (Richard Pipes) اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔

"انقلاب سے پہلے خوقند کی آبادی ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ جو ۱۹۲۶ء میں صرف ۶۹ ہزار تین سو رہ گئی"۔[۲]

خونریز جنگ کے بعد آزاد خوقند کے صدر مصطفٰے چوقائی بچے کھچے ساتھی سمیت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے علماء اور حریت پسند ترکستانی مسلمان اردگرد کے پہاڑی علاقے میں پھیل گئے۔ اور گوریلا جنگ لڑنے لگے۔

خیوا (خوارزم) کی سرنگونی

۱۹۱۸ء کے موسم گرما تک ایدل اورال، داغستان، آذربائیجان خوقند اور قازاقستان ہر جگہ آزادی کی ٹمٹماتی ہوئی لو دم توڑ گئی۔ اب خیوا اور بخارا کی ریاستیں باقی رہ گئیں۔ اب گویا یہ روسی مسلمانوں کی آرزوؤں اور امنگوں کی پناہ گاہیں بھی تھیں اور یاس اور ناامیدی کی امڈتے پھیلتے ہوئے اندھیروں میں امید کی موہوم اور دم توڑتی ہوئی کرنوں کا مرکز بھی۔ مسلم علاقوں کے مسلمانوں نے میدانوں میں شکست کھانے کے بعد فرغانہ اور تاجکستان کے پہاڑوں میں جمع ہو کر گوریلا جنگ شروع کر دی تھی۔ ان ریاستوں سے نہ صرف انہیں افرادی قوت فراہم ہو رہی تھی بلکہ یہیں سے وہ غیر ممالک سے اسلحہ حاصل کرنے کے لئے مذاکرات بھی کر رہے تھے کمیونسٹ اسے کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ سرخ افواج پہلے خیوا کی طرف بڑھیں۔

خیوا داخلی افتراق و تشتت کے ہاتھوں جانکنی کے عالم میں تھا۔ ازبکوں اور ترکمانوں کے درمیان کئی سالوں سے بڑی شدید کشمکش برپا تھی۔ ترکمان محمد قربان، جنید خان نے ۱۹۱۷ء کے بعد پیدا ہونے والے افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاست خیوا پر قبضہ کر لیا۔ خیوا کا خان سید عبداللہ اس کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی بن کر

---

[۱] In the Heart of Asia OP Cit, P. 171.

[۲] 176

رہ گیا۔ ازبک آبادی جنید خان کی سخت مخالف تھی۔ اور وہ اس مخالفت کو جبر و تشدد کے ہتھیاروں سے کچلنے میں مصروف تھا۔ دوسرے مسلمان علاقوں کی طرح یہاں بھی آزاد خیالی کی رو چل رہی تھی۔ کیمونسٹ پارٹی یہاں ۱۹۱۸ء میں نیگی ارگنج کے مقام پر قائم ہوئی۔ جمعہ نیاز سلطان مراد اس کا سرخیل تھا۔ اس سلطان مراد نے نام نہاد سوویٹ جمہوریہ ترکستان کے ساتھ سازباز کی۔ ادھر آزاد خیال جدیدیوں[۱] نے جنید خان سے نجات پانے کے لئے اس سے مدد مانگی۔ ۱۹۱۹ء کے اواخر تک جنید خان اور ازبک عوام کی کشمکش نقطہ عروج پر پہنچ گئی اور بغاوت کی سی کیفیت نظر آنے لگی۔ ہر طرف بدامنی اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ نومبر ۱۹۱۹ء کے اواخر میں سرخ افواج فرنزہ (Frunze) اور کوئبی شیف (Kuiby Shev) کی کمان میں خیوا کی طرف بڑھیں۔ تورت کل (Tort Kul) پہنچ کر دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ خوجہ جیلی کی طرف بڑھا جہاں جنید خاں فوج لے کر پہنچ چکا تھا۔ دوسرے نے نیگی ارگنج کا رخ کیا۔ کیمونسٹوں نے زمین پہلے ہی ہموار کر رکھی تھی۔ ایک دن کی لڑائی کے بعد ۲۹ دسمبر کو جیلی ختم ہو گیا۔ جنید خان نے پیچھے ہٹ کر پھر مزاحمت کی۔ لیکن عام آبادی کی تائید و حمایت سے محروم ہونے کی بنا پر اس کے قدم کہیں بھی جمنے نہ پائے۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو خیوا سرنگوں ہو گیا۔ جنید خان نے بھاگ کر قراقم میں پناہ لی۔ جہاں وہ عرصے تک مردانہ اصرار کے ساتھ مل کر سرخ افواج سے لڑتا رہا۔ خیوا کا خان سید عبداللہ جو محض برائے نام حکمران تھا حکومت سے دست بردار ہو گیا۔ اس کی جگہ جدیدیوں اور کیمونسٹوں پر مشتمل انقلابی کمیٹی نے لے لی۔ اسی روز خیوا عوامی جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

بخارا کا سقوط

اب بخارا باقی رہ گیا تھا۔ اس کی مثال اس کشتی کی سی تھی جو ہولناک طوفان میں گھر چکی ہو۔ اور موجوں کے تھپیڑوں سے اس کا ایک ایک بند اور تختہ ڈھیلا پڑ چکا ہو۔ بادبان پھٹ گئے ہوں اور پتوار ٹوٹے ہوئے ہوں۔ روس میں عبوری حکومت قائم ہوئی تو امیر بخارا نے

---

[۱] جدیدی دراصل اسمٰعیل بے گسپرالی کے طرز فکر کے وہ لوگ تھے جو ایک طرف تو اسلامی تہذیب و ثقافت کے مؤید تھے اور دوسری طرف مسلمانوں کو جدید یورپی ثقافت کے رنگ میں رنگنے اور آزادیِ نسواں اور مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں مغربی طرز کے اصلاحات کے نقیب بھی تھے۔ اسمٰعیل کریمیا کے تاتاری دانشوروں میں آخری شخص تھے جنہوں نے جدیدیت اسلامیت اور تورانیت کو ہم عنان لے کر چلنے کی کوشش کی۔ وہ اسلامی اور ترکی اتحاد کے علمبردار بھی تھے۔ اور روس کے ساتھ مل کر رہنے کے حامی بھی۔

اس سے تعلقات استوار کرنے۔ عبوری حکومت کا ایک وزیر بخارا پہنچا۔ دونوں سلطنتوں کے درمیان جو معاہدے ماضی میں ہوئے تھے ان کی از سرِ نو توسیع و تجدید کی اور بخارا کی آزادی تسلیم کر لی۔ آزاد ہوتے ہی بخارا نے افغانستان کے ساتھ نئی بنیادوں پر روابط استوار کئے سفیروں کا تبادلہ ہوا۔ اور اپنا ایک نمائندہ سفیر بے برطانوی سفیر متعینہ مشہد کے پاس بھیجا۔ ادھر زار کا تختہ الٹتے ہی جدیدیوں کی جدوجہد نئے مرحلے میں داخل ہو گئی۔ اب تک جدیدی نوجوان ترکوں[1] ہی سے متاثر تھے۔ مذہب کی گرفت ذہن و کردار پر ڈھیلی پڑی تو ان کے اندر ہر طرح کے نظریات قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ ایک گروہ روس کے سوشلسٹ انقلاب ہول سے بھی متاثر ہوا۔ اور آگے چل کر سوشلزم کی فتوحات میں اس کا ہراول دستہ بنا۔ امیر لکھتا ہے:۔

"اسی اثنا میں مملکت بخارا کے اندر سعی اصلاح میں مصروف رہا۔ لیکن بالشویک جماعت نے اپنی غیر قانونی اصلیت، اپنے باطل اعتقاد اور ناپاک سلوک کا یہاں بھی اجرا کیا۔ اور رفتہ رفتہ جتنے دن گذرتے گئے ان کا یہ فعل شنیع دولتِ مقدس بخارا میں بھی سرایت کرتا چلا گیا۔ بعض جاہل اور بے علم لوگ جو بے اصل اور رُوسیاہ تھے اور جو بالشویکوں کو اپنے قلب میں جگہ دیئے ہوئے تھے اور بالشوزم کو عام کر دینے کی کوششوں میں مصروف تھے اب پورے انہماک کا ثبوت دینے لگے۔"[2]

قریب قریب ایک سو ستّرہ آدمیوں نے سمرقند و تاشقند والوں کے ساتھ اتحاد اور تعاون کر کے اپنے دو ساتھیوں کو جن کا نام خواجہ فیض اللہ (خوجہ سوف) اور مرزا محی الدین منصور تھا، رہنما بنا لیا۔ چونکہ ان لوگوں کا مقصد بھی بالشویکوں کے مقصد کی حد تھا اس لئے انہوں نے بالشویکوں سے مدد چاہی۔ بالشویک جماعت نے بھی جدید مفسدوں کی مدد کی۔

بخارا کی جدید پارٹی میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ دائیں بازو کے جدیدی بخارا کے امیر کو ختم کرنے کے تو حامی تھے مگر وہ آزادی پسند بھی تھے اور جمہوری اور قومی نقطہ نظر بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی تنظیم کی قانونی منظوری کے لئے امیر سے مذاکرات کا فیصلہ کیا۔ اس پر کمیونسٹ اور بائیں بازو کے جدیدی پارٹی سے الگ ہو گئے اور "نوجوان بخارا" کے نام سے اپنی الگ جماعت قائم کر لی۔ فیض اللہ خوجہ سیف ان کا لیڈر تھا انہوں نے ایک طرف

---

[1] اس سے مراد نوجوان ترکوں کی تورانی تحریک ہے جس کے بانی ابراہیم شیناسی اور نامق کمال وغیرہ تھے۔ [2] بخارا کا جمہوری انقلاب ص ۱۷۔

کولی سیف سے ساز باز شروع کر دی۔ دوسری طرف مزدوروں اور امیر کی فوج میں گھسنے لگے۔ بخارا سے باہر کمیونسٹ پارٹی پہلے ہی سے کام کر رہی تھی۔ اس کی بنیاد ۱۹۱۸ء میں رکھی گئی تھی اور اس کے ارکان کی بھاری اکثریت مملکت بخارا میں رہنے والے روسیوں پر مشتمل تھی۔ "نوجوان بخارا" کے جدیدی امیر کی گرفت سے بچنے کے لئے بھاگ کر تاشقند پہنچے تو ان کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔

فیض اللہ خوجہ سیف کے ساتھ بخت و پز کے نتیجے میں جنرل کولیسوف یکم مارچ ۱۹۱۸ء کو دو سو غدار جوان اور پچاس سرخ فوجیوں پر مشتمل جدید ترین ہتھیاروں، بکتر بند گاڑیوں اور بھاری ہلکی توپوں سے مسلح فوج لے کر بڑھا۔ اور بخارا کا محاصرہ کر لیا۔ امیر کو پیغام بھیجا کہ وہ اس سے کاگام (جدید بخارا) میں آ کر ملے۔ امیر نے بنفس نفیس ملنے سے انکار کر دیا۔ البتہ وزیر اعظم اور قاضی بخارا کو بھیجا۔ کولیسوف نے ایک منشور انہیں دیا۔ اور مطالبہ کیا کہ امیر اس پر بے چون و چرا دستخط کرے۔ منشور میں کہا گیا تھا کہ امیر بخارا تحریر و تقریر کی آزادی دینے، اپنے مشیروں کو برطرف کر کے نوجوان بخارا پارٹی کے ارکان مقرر کرنے، سزائے موت اور جسمانی تعزیر کی تنسیخ اور ٹیکس ختم کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ امیر نے منشور پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اسے الٹی میٹم دے دیا جس پر نوجوان بخارا پارٹی کے صدر فیض اللہ خوجہ سیف کے دستخط تھے۔ کولی سوف کے اپنے بیان کے مطابق منصوبہ یہ تھا کہ امیر کو مذاکرات کی دعوت دی جائے اگر کوئی کولی سوف کے مطالبات ماننے سے انکار کر دے تو نوجوان بخارا قدیم بخارا کے قلعے میں بغاوت کر کے امیر کا تختہ الٹ دیں منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں مشکل پیدا ہو تو سرخ فوج فوراً ان کی مدد کو پہنچ جائے۔ لیکن امیر سے متوقع ملاقات سے ایک دن پہلے شام کے وقت یہ منصوبہ بدل دیا گیا۔ نئے منصوبے کے مطابق طے پایا کہ امیر سے مذاکرات ناکام ہو جائیں تو نوجوان بخارا کا ایک ڈیٹاچمنٹ سرخ فوج کی مدد سے بخارا پر ہلہ بول دے گا۔ ٹھیک اس وقت قلعہ کے اندر بغاوت ہو جائے گی۔ اس خیال سے کہ امیر مملکت کے دوسرے صوبوں سے فوج طلب نہ کر سکے۔ قلعہ کرکی اور چارجوئی کے اضلاع میں بغاوت کھڑی ہو گی۔"[1]

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کمیونسٹ ایک طرف خوقند کے ساتھ الجھے ہوئے تھے تو دوسری طرف اشک آباد میں آزاد حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اور کمیونسٹ لیڈر موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے۔ ادھر جنرل ڈیوٹوف نے اورنبرگ

---

[1] Balshevism in Turkestan OP Cit. P. 25 FN 44

پر قبضہ کر کے ترکستان کو پیٹروگراڈ سے کاٹ دیا تھا۔ بخارا کے مسلمان بے سروسامانی کے باوجود بڑی بہادری سے لڑے کولی سوف نے جب دیکھا کہ بخارا نرم چارہ نہیں ہے اور پیٹروگراڈ سے کمک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں تو صلح کی بساط بچھائی۔

بخارا کی زندگی کے ابھی دو سال باقی تھے۔ اس دوران میں رخ حالات کمیونسٹوں کے حق میں بدل گیا جنرل ڈیوٹوف شکست کھا کر اورنبرگ چھوڑنے اور مغربی ترکستان کی طرف پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح ترکستان اور پیٹروگراڈ کے درمیان سپلائی لائن برقرار ہو گئی۔ انہی دنوں افغانستان کا حکمران حبیب اللہ خان قتل کر دیا گیا۔ وہ انگریزوں کا حامی تھا اور بخارا اس کی وساطت سے انگریزوں سے امداد حاصل کرنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ حبیب اللہ خاں کے چھوٹے بیٹے امان اللہ خان نے اپنے بڑے بھائی عنایت اللہ اور چچا نصر اللہ خان کو باپ کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرا کر گرفتار کر لیا۔ امان اللہ خان نے تخت پر بیٹھتے ہی انگریزوں سے جنگ چھیڑ دی۔ نتیجہ انگریزوں نے وسطِ ایشیا سے صرف نظر کر کے اپنی ساری توجہات برصغیر پاک و ہند کی شمالی مغربی سرحدوں کے تحفظ پر مرکوز کر دیں۔

---

۵ امیر حبیب اللہ خان والیِ افغانستان کے قتل کی اصل وجہ اس کی انگریز نوازی بتائی جاتی ہے اس کے قتل کے حقیقی محرکات کیا تھے اور قاتل کون تھا۔ اس باب میں سو فی صد صحیح اور دو ٹوک بات آج بھی نہیں کہی جا سکتی۔ روسیوں نے حبیب اللہ خان کا قاتل مصطفےٰ صغیر کو قرار دیا جو برطانوی حکومت کا تنخواہ دار ایجنٹ تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امان اللہ خاں نے بھی یہی الزام عائد کیا کہ قاتل برطانوی ایجنٹ تھا۔ یہ الزام خاصا مضحکہ خیز ہے۔ امیر حبیب اللہ خان انگریزوں کا گہرا دوست تھا اسے قتل کرنے سے برطانیہ کو نقصان ہی پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے کہ تخت کے دونوں دعوے دار عنایت اللہ خان اور نصر اللہ خان امیر حبیب اللہ خان کی انگریز نواز پالیسی کے مخالف تھے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ امیر حبیب اللہ خان کی سازش قتل کا سرغنہ محمود طرزی تھا اس کی بیٹی ثریا امان اللہ خان کی بیوی تھی۔ امان اللہ خان تخت کے دونوں دعوے داروں کو اپنے راستے سے ہٹا کر تخت نشین ہوا تو محمود طرزی نے وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالا۔

اس زمانے میں کابل کمیونسٹ ایجنٹوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ان کا سرغنہ میخائیل براؤن تھا جو زار کا ڈپلومیٹ رہ چکا تھا۔ اور اب کمیونسٹوں کے چڑھتے سورج کی پرستش کرنے لگا تھا۔ ان ایجنٹوں کا ہندوستان کی آزادی پسندوں سے جو کابل میں مقیم تھے گہرا رابطہ تھا۔ میخائیل کا ایک خط برطانوی انٹیلی جینس کے ہاتھ لگا جس میں اس نے بالشویک حکومت (باقی صـ پر)

امیر بخارا نے امان اللہ خان کے پاس اپنے قاصد تحفے تحائف دے کر بھیجے جواب میں امان اللہ خان نے بھی ...ن بھیجے۔

دونوں ملکوں کے درمیان وفود کا تبادلہ ہوا۔ لیکن امان اللہ خان اپنے باپ کی طرح کمیونسٹوں کی مخالفت ...تو سرگرم تھا اور نہ یکسو۔ مورخین اسے احتیاط قرار دیتے ہیں یعنی وہ اپنے پہلو میں ابھرتی ہوئی ایک بڑی ...ت سے بگاڑ اور دشمنی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن خود بخارا اور ترکستانیوں میں یہ خیال عام تھا کہ امان اللہ ...ن کے کمیونسٹوں کے ساتھ گہرے روابط ہیں[۱]

...نیس صد ... کے پروپیگنڈہ عکر برائے مشرقی کو لکھا تھا۔ کہ کابل میں مقیم ہندوستانی انقلابیوں کے ساتھ گہرے روابط ...ستوار کرنے میں خاصی کامیابی ہو رہی ہے (دیکھئے ارنلڈ فلیچر کی کتب

...ے تاریخی ریکارڈ میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ محمود طرزی یا امان اللہ خان کے روابط ان کمیونسٹ ایجنٹوں سے تھے ...یں۔ البتہ تخت اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد روسیوں کے ساتھ خفیہ روابط استوار کرنے کی شہادتیں ملتی ہیں۔ بالکل ابتدائی ...یں برطانوی انٹیلی جنس کے ہاتھوں دو خطوط لگے۔ ایک امان اللہ خان کا لینن کے نام اور دوسرا محمود طرزی کا بالشویک ...خارجہ کے نام۔ دونوں خطوط سے ارنلڈ فلیچر کے بقول بالشویک حکومت کے ساتھ اخلاص اور تپاک کا اظہار ہوتا تھا ...و طرزی اور امان اللہ خان امیر حبیب اللہ خان کے آخری دور حیات میں افغانستان کی داخلی سیاست میں جس سرگرمی سے ...لے رہے تھے اس کے پیش نظر یہ بات ناقابلِ تصور ہے کہ ان کی راہ و رسم برطانوی حکومت کی مخالف قوتوں کے خفیہ ...ٹوں کے ساتھ نہ ہو گی۔ روسی حکومت اور امان اللہ خان دونوں کا برطانوی ایجنٹ کو امیر کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرانا کیا محض اتفاق ... روسی حکومت نے قاتل کا نام تک بتا دیا اگر یہ درست ہے کہ مصطفےٰ صغیر ہی قاتل ہے تو کیا یہ امکان نہیں کہ وہ دُہرا کردار ...رہا ہو یعنی ایک طرف وہ برطانیہ کا گماشتہ ہو اور دوسری طرف کمیونسٹ روس کا۔ انٹیلی جنس کی تاریخ میں ایسے دو ...ایجنٹوں کی مثالیں عنقا نہیں۔ جو بیک وقت دو مخالف طاقتوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔ سوویٹ روس نے تو اکثر ایسے ...وں ہی سے کام لیا ہے۔ بہر حال ٹھیک اس زمانے میں جب کہ انگریز وسطِ ایشیا کی بدلتی ہوئی سیاست میں گہری دلچسپی لے ...رہے تھے۔ امیر کا قتل اس شبہ کو تقویت پہنچاتا ہے کہ اس کے پیچھے کمیونسٹوں کا ہاتھ تھا۔ عجب نہیں کہ انہوں نے محمود طرزی ...ساتھ ساز باز کر کے مصطفےٰ صغیر سے اس لئے کام لیا ہو کہ قتل کی ذمہ داری آسانی سے برطانیہ پر ڈالی جا سکے ۔ (روس میں متعدد قومیں

---

[۱] اغلب یہی ہے کہ بقول مورخین امان اللہ خاں احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ پاکستان کی موجودہ قومی (باقی صـ پر)

امان اللہ خان کے مرشد شیخ جلال الدین افغانی تو ۱۹۴۰ء تک کمیونزم کی پرجوش حمایت کرتے رہے
بہرحال حقیقت حال کچھ بھی ہو۔ بخارا یکہ و تنہا رہ گیا۔ سیاسی مشکلات کے علاوہ اسے معاشی و اقتصادی پریشانی
نے بھی آلیا تھا۔ بخارا کے اپنے وسائل اتنے وسیع نہ تھے کہ پوری آبادی کے لئے کافی ہوتے۔ اس کی ضر
کا بڑا حصہ ترکستان اور روس سے آتا تھا۔ کمیونسٹوں نے گندم وغیرہ کی بہم رسانی منقطع کردی تھی۔ ادھر موسم
ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ ۷۰ فیصدی مویشی ہلاک ہوچکے تھے۔ زمین کی کاشت پوری طرح نہیں ہورہی
پوری مملکت میں قحط کی سی صورت پیدا ہوگئی۔ عوام اس اقتصادی اور معاشی بحران سے سخت پریشان
مضطرب تھے۔ سوشلسٹ ایسی صورت حال کو ایکسپلائٹ کرنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ انہوں
پروپیگنڈے کی مہم شروع کردی۔ چنانچہ کسانوں کی بھاری تعداد اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر ترک
سوویٹ جمہوریہ کی طرف چل کھڑی ہوئی اور بخارا میں پھیلی ہوئی افراتفری اور سراسیمگی میں مزید اضافہ ہو
اس افراتفری میں کمیونزم بخارا کی طرف بڑھا۔ اس انداز سے کہ آگے آگے کمیونسٹ پروپیگنڈا
مسحور کرتا جارہا تھا اور پیچھے پیچھے سرخ فوجیں زمین کو مفتوح۔ ہر شہر اور قریہ میں مار آستینوں کا ٹولہ جس
زیادہ تر سرکاری ملازم اور حکام تھے نگاہ و دل فرش راہ کئے سرخ افواج کی آمد آمد کا منتظر تھا۔ جونہی سرخ فو
قرب و جوار میں نمودار ہوتی یہ مار آستین اس سے جا ملتے اس طرح پندرہ سے زائد شہر کسی مزاحمت کے ب
پکے ہوئے سیبوں کی طرح کمیونسٹوں کی جھولی میں گر گئے۔ شہر پر شہر ہاتھوں سے نکل جانے کی خبر سن کر
بخارا کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے برطانوی سفیر سے ملاقات کی لیکن برطانیہ برصغیر کی شمال مغربی سرحد
اپنی مشکلات میں گرفتار تھا۔ البتہ اس نے امیر کا خزانہ بحفاظت تمام منتقل کرنے کی حامی بھرلی۔

۳۰ راگست ۱۹۲۰ء کو سرخ افواج بخارا کی فصیل تلے پہنچ گئیں۔ اور انہوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا
مسلمان مکمل دفاعی انتظام کرچکے تھے۔ فصیل کے چاروں طرف گہری خندق کھود دی گئی تھی۔ اور ریل
لائن کی حفاظت کے لئے بخاری افواج متعین کی جاچکی تھیں۔ مسلمانوں کو چاق و چوبند دیکھ کر کمیونسٹوں

بقیہ صفحہ حکومت بھی افغانستان اور خود ہی پاکستان کے معاملے میں روسی سامراج کے حق میں ا
حزم و احتیاط سے کام لے رہی ہے۔ لیکن حالات کے آئینے میں صاف دکھائی دے رہا ہے کہ جس طرح امان اللہ خان کا
کو روس کی ہوسناک نگاہوں اور سامراجی جارحیت سے نہ بچا سکا اسی طرح موجودہ حکومت کا یہ محتاط رویہ پاکستان کو بچانے میں کام نہ آ

بجائے خدع و تزویر سے کام لینے کا فیصلہ کرلیا۔ امیر بخارا لکھتا ہے :-

"بالشویکوں نے اس موقعہ پر چاپلوسی دکھائی اور سابقہ روابط اور دوستی کا اعادہ چاہا..... ایک شخص بیرانوف نامی وزیر خارجہ کو وزیر مختار بنا کر تاشقند سے بھیجا۔ یہ شخص بخارا آیا اور مجھ بندہ عاجز سے ملاقی ہوا۔ عذرخواہی کرکے اس نے پھر گفت و شنید کی اور معاہدہ کیا۔ اس نے عرض کیا کہ دولت روس نے ۵۵ سال تک دولت بخارا سے دوستی اور صلح رکھی ہے۔ اور اس وقت تک ہماری حکومت کو سلطنت بخارا سے فائدہ ہی فائدہ رہا ہے۔ اور کوئی نقصان یا شکایت جانبین میں پیدا نہیں ہوئی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ چند دن کے اندر اندر پھر دونوں حکومتوں میں دوستی اور آشنائی کا ظہور ہوجائے تو مناسب ہے۔ تاکہ آپ کی سلطنت سے ہم اعانت و منفعت حاصل کریں اور ہماری دولت جمہوری سے جو بھی خدمت ممکن ہوسکے ہم آپ کی سلطنت کو پہنچائیں۔

لیکن اس نے استدعا کی کہ ہماری بے اعتمادی دور کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنی فوجوں کو ریلوے اسٹیشنوں سے ہٹالیں۔ ہماری فوجیں وحشی اور نادان سپاہیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ مبادا یہ حادثہ پیش آئے کہ آپ کے لشکر کو دیکھ کر ان کا مقابلہ کر بیٹھیں اور ذات شاہانہ کے سامنے ہمیں شرمسار ہونا پڑے۔"[1]

امیر اس دام فریب میں آگیا۔ مذاکرات کے بعد معاہدے کی تجدید ہوئی اور روسی سفیر اپنے وطن چلا گیا۔ امیر نے اسے بڑے اعزاز کے ساتھ اسے رخصت کیا۔ چند اشخاص بطور رہبر اس کے ساتھ کئے۔ روسی سفیر نے رخصت ہوتے وقت امیر کو یقین دلایا کہ

"ہر معاملے میں جو آپ کی خواہش و رضامندی ہوئی۔ ہم بر وقت طے کرلیں گے۔"

امیر نے مختلف اسٹیشنوں اور ریلوے لائن سے چند مختصر دستوں کے سوا ساری فوج تین میل پیچھے ہٹالی۔[2]

سادہ لوحی یا بے بسی ملاحظہ فرمائیے۔

۱؎ بخارا کا جمہوری انقلاب ص ۲۲، ۲۳   ۲؎ حوالہ سابق ص ۲۳

"سوچا یہ کہ شاید اسی طرح ان مخصوص دشمنوں کے ظلم سے بندگان عاجز رہائی پالیں"[1]

اس فریب کا پردہ اس وقت چاک ہوا جب ۲ اگست ۱۹۲۰ء (۱۵ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ) کو آدھی رات کے وقت سرخ افواج نے بخارا پر یلغار کردی[2]۔ اس بات کا پورا اہتمام برتا گیا کہ دشمن کو خبر نہ ہونے پائے[3]۔ حملے کا سارا منصوبہ انتہائی راز میں رکھا گیا۔ سرخ افواج زبردست توپوں۔ بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں کے ساتھ دو سمت سے بخارا کی طرف بڑھیں۔ ایک فوج کاگان (جدید بخارا) کی جانب سے اور دوسری ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ راستے میں کہیں بھی مزاحمت نہ ہوئی۔ امیر اپنی افواج پہلے ہی پیچھے ہٹا چکا تھا جو مختصر سے گروپ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ مختلف مقامات پر متعین تھے اور ان کی مجموعی تعداد ۱۵۰ فوجی جوانوں سے زیادہ نہ تھی) انہیں کمیونسٹوں نے غفلت اور بے خبری میں آلیا۔ اور گولی چلائے بغیر گرفتار کرلیا۔ ٹھیک ۴ بجے جب کہ اہل بخارا نمازِ صبح کے لئے بیدار ہو رہے تھے توپ نے پہلا گولہ بخارا پر پھینکا جلد ہی گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ بخارا نے بے سرو سامانی کے باوجود شدید مزاحمت کی۔ مسلمانوں نے روسی فوجوں کا جس شجاعت اور مردانگی کے ساتھ مقابلہ کیا اس کا حال خود ہی کولی سیف (روسی فوجوں کے کمانڈر اعلیٰ) کے رفیق فیض اللہ خدیو کی زبان سے سنئے:۔

> "قدامت کے مجنون فدائی ملا اپنی بے سرو سامانی کے باوجود نہایت دلیری کے ساتھ لڑے ان کے ہاتھ میں صرف چاقو، کلہاڑے اور زنگ آلود تلواریں تھیں۔ میں نے خود ایک مسلمان کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک سونٹا تھا۔ دانتوں میں تلوار دبائے وہ بے جھجک مشین گن کی طرف بڑھا اور مشین گن چلانے والے کو مار دیا[4]"۔

---

[1] کمیونزم کے بارے میں ہر جگہ مسلمانوں نے یہی غلطی کی (یعنی مصلحت پسندی کا رویہ اختیار کرنا) اور کر رہے ہیں۔ اگر مخلوق خدا کو جبر و تشدد سے کفر پر آمادہ کرنے والی سوشلزم کے خلاف جارحیت کی سکت باقی نہیں تو کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ کم از کم مدافعت کے لئے تو سر دھڑ کی بازی لگادی جائے اور ہونہ ہو تو ایک مومن کی موت مر جائے۔

[2] بخارا کا جمہوری انقلاب ص ۲۴ [3] ایضاً

[4] صبح سمرقند ص ۱۴۔ اردو ترجمہ مطبوعہ فرینڈز پبلی کیشنز۔ ملتان۔ تالیف جوشا کونٹر۔ (بحوالہ روس میں مسلمان قومیں)

بالآخر امیر کی فوج کمیونسٹوں کے حملے کی تاب نہ لاکر بخارا قدیم کی طرف ہٹ گئی۔ بہت سا اسلحہ اور قیدی سرخ فوج کے ہاتھ لگے۔ کاگان اور بخارا قدیم میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں۔ دوپہر کے قریب سرخ افواج کے چند دستے بخارا قدیم کے مضافات میں پہنچ چکے تھے۔

بخارا کی فوج اور عام شہری اپنی جانوں پر کھیل گئے مگر آتش و آہن کا سیلاب روکنا ان بے سرو سامان بہادروں کے ہاتھ میں نہ تھا۔ بلائی موخقہ کی توپیں اور گیارہ طیارے دن رات گولہ باری میں مصروف رہے۔ امیر بخارا کے الفاظ میں اس بمباری سے آدھا شہر تباہ ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود بخارا چار دن تک لڑتا رہا۔ بعض مواقع ایسے بھی آئے کہ سرخ فوج کے قدم اکھڑنے لگے لیکن فوراً ہی انہیں تازہ دم کمک پہنچ گئی کیونسٹ سامراجی ہر قیمت پر وسط ایشیا[1] میں مسلمانوں کے اس آخری حصار کو فتح کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ غداروں اور مار آستینوں کے ایک گروہ بخارا کے اندر موجود تھا جس کا نہ صرف حملہ آور فوج کے ساتھ رابطہ قائم تھا بلکہ خود مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لئے گوناگون افواہیں پھیلا رہا تھا۔ اس طرح باہر سے سرخ سامراجی افواج اپنی پوری قوت سے حملہ آور تھیں۔ اور دن رات آگ اور لوہے کی بارش کر رہی تھیں۔ اور اندر سے ملک و ملت کے غدار نقب لگا رہے تھے۔ کسی قوم کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس کے اندر غداروں کا گروہ نہ صرف موجود اور سرگرم کار ہو بلکہ اسے برداشت کیا جائے۔ گذشتہ دو تین صدیوں میں مسلمانوں نے اپنے ملکوں میں جہاں کہیں مغربی اور مشرقی سامراجیوں کے ہاتھوں شکست کھائی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس کا ایک اہم ترین سبب ان کے درمیان پائے جانے والے غدار اور مار آستین تھے[2]۔

بخارا زبردست مزاحمت کے بعد سرنگوں ہو گیا۔ امیر اور اس کے ساتھیوں نے جب دیکھا کہ جنگ ہر چکی ہے تو کمیونسٹ فوجوں کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے نکل گئے[3]۔

امیر کے ساتھ افغانی سفیر اور افغانی عساکر کے قاضی کے علاوہ اپنے اعلیٰ افسر بخاری افواج کا اسٹاف

---

[1] موجودہ روسی جغرافیہ دان ترکستان کو ترکستان نہیں بلکہ وسط ایشیا کہتے ہیں۔ ترک کا لفظ مسلم کے ہم معنی ہے اس لئے روسی حکومت نے لفظ ترک کو ہر جگہ محو کرنے کی کوشش کی ہے (سرخ اندھیروں میں ص ۱۶) [2] روس میں مسلمان قومیں ص ۱۴ [3] بخارا کا جمہوری انقلاب ص ۲۵، ۲۶

افغانی فوج (جو امیر حبیب اللہ خان نے اپنے زمانے میں بطور امداد بھیجی تھی) کل تقریباً ۲۵ ہزار افراد تھے۔ امیر کی ہجرت کی خبر پھیلی تو عامتہ المسلمین میں ہیجان اور اضطراب پھیل گیا اور تقریباً دس ہزار آدمی عجزدان پہنچ گئے۔ امیر بخارا سے بدھ کے روز روانہ ہوا جمعرات کو عجزدان پہنچا وہاں سے مشرقی بخارا کا عزم کیا۔ آٹھ دن کے بعد خورقان پہنچا۔ جو بخارا کا ایک صوبہ تھا۔ وہاں گیارہ دن قیام کیا اور عین اس وقت جب کہ یہ قافلہ دریائے عجزدان عبور کر رہا تھا دشمن کی بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک سامنے سے نمودار ہوئے راستہ مسدود پاکر امیر دربند پہنچا۔ اسی دوران امیر نے صوبہ حصار سے فوج بھرتی کی۔ دربند میں فوج کا ہراول دستہ چھوڑا اور خود پیچھے ہٹ کر اور حصار مشرقی کو مرکز بنا کر جنگ چھیڑ دی۔ چھ مہینے تک قدم قدم پر روسی افواج کی مزاحمت کی گئی۔ سخت جان بخاریوں کی شدید مزاحمت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ماسکو سے تازہ دم افواج اور سامانِ جنگ پہنچ گیا۔ امیر نے امداد و اعانت کے لئے ہاتھ پاؤں مارے مگر کہیں سے کوئی مدد نہ ملی۔ دس روز تک سخت جنگ کے بعد امیر بخارا کمیونسٹ مآخذ کے مطابق کابل کی طرف فرار ہوگیا۔ لیکن خود امیر بخارا کا بیان ہے کہ وہ اپنے فوجی افسروں کے مشورے پر فوجی مدد لینے کے لئے کابل گیا۔[1]

ترکستان کی نئی تقسیم اور مذہب کے ساتھ بالشویکوں کے تین روئیے

ترکستان پر مکمل قبضہ کرنے کے بعد بالشویکوں نے اس کو پانچ جمہوریتوں میں تقسیم کیا۔

۱۔ ازبکستان ۲۔ تاجکستان

۳۔ ترکمانستان ۴۔ قرغیزستان

۵۔ قازقستان

ان پانچ جمہوریتوں کے نام بھی قبائلی عصبیتوں سے اخذ کئے گئے اور ہر جمہوریہ کا نام الگ نسلی عنصر کی بنیاد پر رکھا گیا۔ تاکہ ان کے درمیان قومی اور نسلی عصبیت کی آگ ہمیشہ کے لئے دہکتی رہے۔ اور وہ کبھی بھی سوشلزم کے مقابلے میں متحد نہ ہو سکیں۔[2]

[1] بخارا کا جمہوری انقلاب ص ۲۸، ۲۹ [2] سرخ اندھیروں میں ص ۱۵، ۱۶

بالشویکوں نے ترکستان میں مذہب کو ختم کرنے کے لئے تدریج سے کام لیا۔ پہلے مرحلے میں منافقت کا رویہ برتا گیا۔ یہ مرحلہ ۱۹۱۷ء یعنی انقلاب کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ اور ۱۹۲۹ء پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بارہ سال روس کے اندر خانہ جنگی کے سال کہلاتے ہیں۔ ایک طرف عالمی جنگ کے اثرات باقی تھے اور دوسری طرف منشویک، درمیانہ طبقہ کے اعتدال پسند اور معاشرتی جمہوریین کا اثر تھا۔ اس عدم استقرار کی وجہ سے بالشویکوں نے مذہب کا کھلم کھلا قلع قمع کرنے کی بجائے منافقت ریاکاری اور پروپیگنڈے کا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے زور شور سے یہ پروپیگنڈہ کیا کہ سوشلزم اور اسلام کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ اور قرآنی آیات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ کمیونزم اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک پلیٹ فارم پر جمع کئے جا سکتے ہیں[1] ترکستان کے اخبارات نے بھی یکایک یہ مبالغہ آمیز مضامین چھاپنے شروع کر دیئے کہ اسلام کے اندر جمہوریت کا روح غیر معمولی حد تک پائی جاتی ہے۔ اور علمائے حق بڑے جمہوریت پسند اور عوام کے خیر خواہ ہیں۔ داغستان کے اندر تو کمیونسٹوں نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے "عوامی شرعی ایجنسی" بھی قائم کر دی۔

دوسرا مرحلہ ۱۹۳۰ء سے شروع ہوا اور ۱۹۴۱ء تک جاری رہا۔ اس دور میں بالشویکوں نے یک بارگی دین پر حملہ شروع کر دیا اور مسلمانوں کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے مذہبی مراکز اور مسجدوں کو پیوند خاک کر دیا۔ تیسرا مرحلہ موقع پرستی کا مرحلہ کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں دوسری عالمگیر جنگ چھڑ چکی تھی اور بالشویک حکومت نے دنیا کی مسلمان حکومتوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے شروع کر دئے تھے۔ اس دور میں تشدد اور سخت گیری کی پالیسی میں تبدیلیاں کی گئیں۔ خارجہ سیاست میں پروپیگنڈے کا رنگ غالب آ گیا اور باہر کے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ اور ملک کے اندر سائنس کی بنیادوں پر الحاد اور دہریت کو فروغ دینے کی مہم جاری کر دی گئی۔



[1] ملاحظہ ہو اعلامیہ "ریلیوسیونی دوستک" شمارہ ۳ بابت ۲۴-۱۹۲۳ء ص ۲۰۴ اور مابعد مطبوعہ ماسکو [2] سرخ اندھیروں میں ص ۵۹

باب پنجم

سوشلزم کی مذہب اور اخلاق دشمنی



مذہب واخلاق وہ بنیادی قوتیں ہیں جن سے انسانی معاشرے نہ صرف مادہ پرستی سے محفوظ رہتے ہیں بلکہ ان سے زندگی اور نشوونما پاتے ہیں. یہی قوتیں ان کے اندر اپنی قومی زندگی اور قومی تہذیب وثقافت کی حفاظت و دفاع کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ اور انہیں کارزار حیات میں زندہ رہنے کا اہل بناتی ہیں۔ یہ سرچشمہ زندگی اور اس سے حاصل ہونے والا تہذیبی و ثقافتی سرمایہ محفوظ رہے تو سیاسی غلامی کی رات کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے آزادی کی صبح طلوع ہو کر رہتی ہے لیکن اگر کسی قوم کو اس سرمایۂ حیات سے محروم کر دیا جائے تو وہ نہ صرف سیاسی طور پر ہمیشہ کے لئے غلام بنا کر رکھی جا سکتی ہے بلکہ اس کے جداگانہ قومی تشخص کو بھی موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے. چونکہ مارکسی سوشلزم سامراجیت ہی کا دوسرا نام ہے جو قوموں کی جداگانہ ہستیوں کو توڑ مروڑ کر اور نگل نگل کر ہضم کرنے اور جزو بدن بنانے کی سعی وجہد کرتی ہے۔ اسی بنا پر وہ مذہب واخلاق کو اپنی راہ کا سب سے بڑا پتھر سمجھتا ہے۔ وہ اس پتھر کو راستہ سے ہٹانے اور پاش پاش کرنے پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ اور اسے اپنی جدوجہد کا اہم ترین ہدف قرار دیتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ علمی اور عملی دونوں میدانوں میں مذہب واخلاق کے خلاف شدید معاندانہ فضا پیدا کرتا ہے. سوشلزم کے مارکسی مکتب فکر اور اس کے علمبرداروں نے سوشلزم کو ایک تحریک کی صورت دی۔ روس اور چین میں اسے عملاً نافذ کیا اور جب بھی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اس سے مراد یہی سائنٹیفک سوشلزم ہوتا ہے[1]

---

[1] روس میں مسلمان قومیں ص ۱۸۶

اصولی طور پر تو مارکس کے مادی نظریۂ تاریخ سے مذہبی تصورات اور اخلاقی قدروں کی بے ثباتی اور بے تعمیری کا اندازہ ہو ہی گیا کہ جب افکار و خیالات جدلی عمل کے تحت بدلتے ہوئے خارجی حالات کا قدرتی نتیجہ ہیں تو کوئی بھی عقیدہ ابدی صداقت نہ رہا اور اس کے اختیار کرنے میں انسان آزاد نہ رہا۔ آج کا عقیدہ آج کے خارجی حالات کا لازمہ ہے۔ آج اس کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اور کل کے نئے حالات میں اس کو کسی طرح بھی رکھا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ نہ تو خدا ..... کائنات کے حاکم اعلیٰ ..... اور رسول ..... خالق و مخلوق کے درمیان واسطے ..... کے وہ مفہومات قابلِ تسلیم ہیں جو اہل مذاہب نے متعین کئے ہیں۔ اور نہ ہی خارجی حالات کے ہاتھوں مجبور و بے لبس انسان کی اپنے اعمال و اقوال کے لئے کسی کے سامنے جواب دہی کا وہ تصور صحیح رہا جس کے لئے قیامت ..... دوسری زندگی ..... کو ناگزیر قرار دیا جاتا ہے۔ اور جب امر واقعہ یہ ہے تو ان اخلاقی قدروں کی بھی کوئی قدر و قیمت نہ رہی۔ جو ان جیسے مذہبی تصورات سے ماخوذ اور ان کی شان و شوکت اور تاثیر کو قائم رکھتے ہیں۔ لیکن مارکسیت اپنی اس انقلابی تحقیق کی اس سرسری تعلیم اور ضمنی تفہیم پر قانع نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ مذہبی احساسات کو ایک ایک کر کے تحقیر و تضحیک کا نشانہ بناتی ہے۔ اور اس کے علمبردار افراد و اداروں کی سرکوبی اپنا اولین فرض سمجھتی ہے۔

مذہب کی تحقیر

سائنٹیفک سوشلزم کا بانی کارل مارکس کہتا ہے۔ "مذہب عوام کے حق میں افیون کا اثر رکھتا ہے"۔ ۱

پہلی سوشلسٹ ریاست کا بانی اور مارکسزم کا علمی و فکری شارح لینن مذہب سے جنگ کرنا کمیونسٹ پارٹی کا فرض عین قرار دیتا ہے۔ وہ مارکس کے قول "مذہب افیون ہے" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"مذہب کے متعلق مارکس کا یہ قول تمام مارکسی عقائد کا گویا بنیادی پتھر ہے۔ مارکسیت کے نزدیک مذہب، کلیسا، عبادت گاہیں اور تمام مذہبی تنظیمیں محنت کش طبقے کے استحصال کے لئے رجعت پسند طبقہ "اوسط" کے ہاتھ میں ہتھیار کا کام دیتی ہیں۔ مذہب سے جنگ کرنا ہمارا فرض ہے یہی مادی اصول کی الف ب ہے"۔ ۲

---

۱ مارکس نے یہ فقرہ ہیگل کے فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے

Engles : Historical Materialism, P. 115

۲ Lenin : On Religion, P. H.

لینن ایک اور مقام پر لکھتا ہے۔

"مارکسیت مادیت کا دوسرا نام ہے اور اس اعتبار سے یہ مذہب کی کٹر دشمن ہے مارکسیت کی الف، ب یہ ہے کہ انسان کو مذہب سے لڑنا چاہیئے مگر مارکسیت چھوٹی موٹی مادیت نہیں کہ صرف الف، ب پر اکتفا کر کے بیٹھ جائے یہ اس سے آگے قدم بڑھاتی ہے اور کہتی ہے کہ انسانیت کو مذہب کے خلاف لڑنا ہی نہیں اپنے آپ کو اس لڑائی کا اہل بھی بنانا ہے"۔ ۱

ایک اور موقع پر کہتا ہے :-

"مذہب کے خلاف ہماری جنگ محض عقائد کی تبلیغ تک محدود نہیں رہنی چاہیئے۔ اس جنگ کا محنت کش طبقات کی تحریک کے ساتھ مربوط ہونا ضروری ہے نیز اس کا مقصد مذہب کا قلع قمع ہونا چاہیئے"۔ ۲

لینن ایک اور موقعہ پر کہتا ہے :-

"مذہب ایک روحانی لوٹ کھسوٹ کا طریقہ ہے جو ہر جگہ لوگوں پر ایک بھاری بوجھ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان لوگوں پر جو قبل ازیں دوسروں کی خاطر کام کرنے کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ اور جو محتاج ہیں اور اکیلے ہیں۔ مظلوم طبقے کی بے بسی انہیں آخرت پر یقین دلاتی ہے۔ وہ لوگ جو محنت شاقہ کرتے ہیں اور پھر بھی ان کی ضروریات عمر بھر پوری نہیں ہوتیں۔ انہیں مذہب یہ سکھاتا ہے کہ وہ تابعدار اور شکرگزار رہیں جب تک کہ وہ اس دنیا میں ہیں اور آسمانی انعام پر اپنی امیدیں باندھ رکھیں اس کے برعکس جو دوسروں کی کمائی اڑاتے ہیں انہیں مذہب یہ سکھاتا ہے کہ جب تک وہ زمین پر ہیں خیرات کرتے رہیں اور اس طرح سے اسے اپنا وجود بطور لوٹنے والے کے قائم رکھنے کا ایک نہایت ہی سستا طریقہ بتا دیتا ہے۔ اور نہایت ہی خفیف قیمت پر جنت کے ٹکٹ فروخت کر دیتا ہے"۔ ۳

Lenin : On Religion, P. 21

V.I. Lenin on Religion, P. 17

اس کے بعد وہ کہتا ہے :-

"عصر حاضر کا وہ کارکن جسے طبقاتی اختلافات کا علم ہے اور جو فیکٹریوں میں کام کرنے کے تجربے سے روشن بصر ہو چکا ہے۔ وہ نہایت ہی نفرت سے مذہبی عقائد کو دور پھینکتا ہے جنت کی خوشیاں پادریوں اور سرمایہ داروں کے حوالے کرتا ہے اور وہ اپنے لئے یہاں اسی زمین پر اچھی زندگی پانے کی جدوجہد کرتا ہے"[1]

جمہوریت کی قدردانی اور انسانیت کی واقعی اور سب سے زیادہ بہی خواہی کی دعویدار نام نہاد یورپی روشن خیالی بھی اجتماعی دائرے میں مذہب کی مخالف ہے تاہم وہ اسے کم ازکم فرد کا نجی اور شخصی معاملہ قرار دینے کی روادار ہے اور اپنی ذات کی حد تک کوئی بھی سمتِ راہ متعین کرنے اور اس پر کاربند رہنے میں اس کو قطعاً آزاد سمجھتی ہے لیکن لینن مذہب کو شخصی دائرے میں محصور رہنے پر بھی خوش نہیں وہ الفاظ کے ہیر پھیر میں مذہب کو محنت کشوں کا سب سے بڑا مد مقابل ٹھہرا کر ان کو اس سے نبرد آزما ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"جمہوریت کی جدوجہد میں غریب طبقہ کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ضرورت یہ ہے کہ ضمیر آزاد ہو۔ مذہب ریاست سے الگ ہو جہاں تک ریاست کا تعلق ہے مذہب کو کسی شخص کا نجی معاملہ قرار دیا جائے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ غریب طبقہ صرف مذہب سے بے اعتنائی برتے بلکہ مذہب غریب طبقے کا نجی معاملہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ غریب طبقے کی سائنسی اور دنیاوی نظریئے کا تقاضہ یہ ہے کہ مذہب کے خلاف ایک ناقابل مفاہمت اور مسلسل نظریاتی جنگ کرے"[2]

اسی سلسلے میں مارکسزم کے "روح القدس" اینگلز کا ایک بیان پڑھیے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

"پرولتاری سوشلسٹ پارٹی کے لئے مذہب کوئی خانگی معاملہ نہیں ہماری پارٹی طبقہ وارانہ شعور رکھتی ہے۔ اور مزدوروں کی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی ہے ایسی جماعت مذہبی اعتقادات کی پیدا کردہ جہالت سے غفلت نہیں برت سکتی ہماری پارٹی کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی ہے کہ مزدوروں کی مذہبی فریب خوردگی

---

۱ V.I, Lenin on Religion P. 8,

۲ P. 5.

دور کی جائے"[1]

لینن کے بعد سٹالن کو سوشلسٹ دنیا میں تقریباً ۳۰ برس تک بلند ترین مقام حاصل رہا۔ وہ مذہب کے بارے میں سوشلزم اور کمیونسٹ پارٹی کا موقف مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے :-

"جہاں تک پارٹی کے نقطۂ نظر کا تعلق ہے مذہب کے بارے میں اس کے لئے غیر جانبدارانہ موقف اختیار کرنا ممکن نہیں اس کا فرض ہے کہ وہ مذہب اور ہر طرح کی مذہبی خرافات کے خلاف پروپیگنڈہ کرے اس لئے کہ سوشلزم علم کو فعال قوت بناتا ہے جب کہ مذہبی خرافات علم کے منافی ہیں۔ بلاشبہ ہر مذہب علم کے متناقض ہے"[2]

سوویٹ روس کے انسائیکلوپیڈیا کلاں میں ہے۔

"پارٹی کے منشور کی دفعہ ۱۳ میں کہا گیا ہے کہ پارٹی کے لئے یہی کافی نہیں کہ وہ مذہب کو ریاست سے اور مذہب کو تعلیم سے الگ کرنے کی قرارداد منظور کرے بلکہ اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مذہبی اداروں کو نیست و نابود کر دینے کے لئے عملاً جدوجہد کرے"[3]

موقعہ شناسی اور مصلحت بینی

بایں ہمہ کہ سوشلزم بلا استثناء تمام مذاہب کا جانی دشمن ہے۔ وہ مذہب دشمنی میں حکمت و مصلحت سے کام لینا نہیں بھولتا۔ وہ حالات کی مساعدت اور نامساعدت کا خیال رکھتا ہے۔ سازگار ماحول میں بھرپور وار کرتا ہے لیکن ناسازگار فضا میں نہ صرف اپنی عداوت کو چھپاتا ہے بلکہ خیر خواہی کا لبادہ اوڑھ کر دوستی کی ڈینگیں مارتا ہے۔

اینگلز کے خیال کے مطابق......

"مذہب کے خلاف علی الاعلان جنگ کرنا بے وقوفی ہے کیونکہ اس قسم کی جنگ کا اعلان مذہب کو زندہ کر دے گا اور فی الحقیقت اسے ختم ہونے سے بچالے گا۔ مذہب ختم کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مزدوروں کی تنظیم کی جائے۔ اور انہیں تعلیم دی جائے جس کا نتیجہ

---

۱ Engles : Historical Materialism, P. 115

۲ Stalin's Works (4th Edition) 1950. Vol. 35 P. 89

۳ مقالہ : ۱۔ کولوسوف، مذہب اور کلیسا، ۱۹۴۷، کالم ۱۷۸۱

یہ ہوگا کہ مذہب مر جائے گا۔"[1]

لینن کے اس قول کے باوجود کہ طبقاتی جنگ کے ساتھ ساتھ مذہب کے خلاف بھرپور جنگ بھی جاری رہنی چاہیئے اور معاشرے کے اندر مذہب کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔[2] وہ کبھی کبھی مذہبی رواداری کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ اس کی وجہ خود لینن کی اس قرارداد میں واضح کی گئی ہے جو مارچ ۱۹۱۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کی آٹھویں کانگریس میں اس نے منظور کرائی تھی ترکستان اور قوقاز کی اقلیتوں کے بارے میں حکومت کو احتیاط کا پہلو برتنے کی نصیحت کرتے ہوئے قرارداد میں کہا گیا۔

"ہمیں انتظار کرنا چاہیئے یہاں تک کہ اقلیتی حکومتوں کی تبدیلی مکمل اور پختہ ہو جائے اور عوام درمیانہ طبقہ کا بوجھ کندھوں سے اتار پھینکیں۔ بیشک اس بوجھ سے وہ عنقریب نجات پالیں گے۔"[3]

مذہب پر جارحانہ حملے چھوڑنا تو درکنار ضرورت کے وقت بعض سوشلسٹ پکے دیندار اور متدین بن جاتے ہیں اور دینداروں کے ساتھ دینی شعائر اور اعمال تک میں مشارکت کا بڑی باقاعدگی سے اہتمام کرتے ہیں ایک اشتراکی مصنف لکھتا ہے :۔

"سوویٹ ایشیا میں بے شمار مسلمان ایسے تھے جو اپنی ذاتی زندگی میں پکے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن بھی تھے اور اشتراکی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں سرگرم حصہ لے رہے تھے۔"[4]

ایک اشتراکی سیاح نے جب اس بات پر تعجب کیا کہ بعض کمیونسٹ ابھی تک اسلامی شعائر کے پابند ہیں تو مرکزی کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے سلوچک نے جسے تاجکستان بطور نگران بھیجا گیا تھا، جواب دیا :۔

"یہ بات ہمارے لیے ذرا بھی تشویشناک نہیں۔ ان پسماندہ علاقوں میں ہمارا اولین معیار یہ ہے کہ کیا کوئی شخص زمینداروں سے زمین چھیننے کی مہم میں ہمارے ساتھ ہے۔ اجتماعی زراعت اور صنعتانے (Industrialization) کے معاملے میں ہمارا

---

[1] V.I. Lenin : On Religion, P. 18 [2] کلیات لینن ایڈیشن ۱۹۵۲ء، جلد ۱۰ص ۳،۴

[3] ایضاً ایڈیشن ۱۹۵۰ء جلد ۲۹ ص ۱۵۱ مطبوعہ ماسکو [4] Wilfred Smith Religion in the U.S.S.R. P. 21

ساتھ دیتا ہے اور ہمارے لائحہ عمل کی خاطر لڑنے کو تیار ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو ہم اسے پارٹی کی رکنیت کا اہل قرار دیتے ہیں۔ آپ کو یہ بات لازماً پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ عوام کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے ہمیں اپنے اندر لچک پیدا کرنی ہوگی۔ ہم پر ایک پورے معاشرے کی تعمیر نو کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم فرقہ پرستی کی طمانیت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ہاں پارٹی کی رکنیت کے لئے مارکس اور لینن کے مادہ پرستانہ افکار کو اپنانا لازمی شرط نہیں۔ تاہم جب کوئی مقامی شخص پارٹی میں آجاتا ہے تو اس میں ہماری تعلیم اور اس کے اثرات سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے چند ماہ بعد وہ بتدریج ہمارے خیالات اپنا لیتا ہے۔ ہم ایک عبوری دور سے گذر رہے ہیں اس لئے اگر آپ کا سامنا عجیب رنگ کے کمیونسٹ سے ہوتا ہے تو فطری بات ہے۔"[1]

○

خدا کا انکار

لینن کہتا ہے :

"عملی طور پر خدا کا تصور سرمایہ داروں کی امداد کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو غلام بنائے رکھیں درحقیقت خدا کے تصور کو حسین بنانے کا مقصد ان زنجیروں کو خوشنما بنانا ہوتا ہے جن سے سرمایہ دار جاہل مزدوروں اور کسانوں کو اپنی غلامی میں جکڑ کر رکھتے ہیں خدا کے تصور نے ہمیشہ معاشرے کے احساسات کو دبایا ہے۔ چونکہ خدا کا تصور غلامی کا تصور ہے (بدترین اور مایوس کن غلامی) اس لئے زندہ احساسات کی بجائے مردہ حسیتیں آگے لایا ہے خدا کے تصور نے کبھی بھی ایک فرد کو معاشرے سے نہیں ملایا بلکہ اس نے ہمیشہ مظلوم طبقے کو ظالم طبقے کے تقدس کے ساتھ باندھ دیا ہے۔"[2]

---

[1] Dawn over Samarkand OP Cit. P. 212.

[2] V.I. Lenin on Religion, P. 42.

لینن کا قول ہے کہ ہر سوشلسٹ اصولی طور پر دہریہ ہوتا ہے۔[1] وہ مزید کہتا ہے کہ:۔

"خدا کی ہستی کے معاملے میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہم خدا پر یقین نہیں رکھتے اور ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ مذہبی پیشواؤں، زمینداروں اور سرمایہ داروں نے خدا کا تصور پیدا کیا ہے تاکہ وہ بطور لوٹنے کھسوٹنے والوں کے اپنے مفاد کا تحفظ کرسکیں۔"[2]

میکسم گورگی (MAXIM GORKY) نے ایک اخبار میں مضمون لکھا کہ

"خدا کی تلاش فی الحال بند کردینی چاہئے یہ ایک بیکار مشغلہ ہے جہاں کسی چیز کے ملنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا وہاں تلاش بے سود ہے جب تک کوئی چیز بوئی نہ جائے کاٹنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تم نے ابھی تک کوئی خدا بنایا ہی نہیں ہے خداؤں کو تلاش نہیں کیا جاتا۔ خدا بنائے جاتے ہیں۔ تم زندگی کی تشکیل نہیں تخلیق کرتے ہو۔"

یہ مضمون جب لینن کی نظر سے گزرا تو وہ سخت برہم ہوا اور صاحب مضمون کو لکھا۔

"تم خدا کی تلاش کے مخالف ہو صرف اس لئے کہ اس کے بجائے خدا بنانا چاہتے ہو۔ خدا کی تلاش یا خدا کے بنانے کا کام ایک ہی چیز ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے جیسا کہ ایک شیطان دوسرے شیطان سے مختلف نہیں ہوتا۔ خدا کی پوجا مردے کی پوجا (Necrophily) ہے چاہے وہ جس قدر مخلصانہ اور روحانی ہو۔"[3]

پھر آگے چل کر اس نے لکھا:۔

خدا کا تصور ایک شرمناک متعدی بیماری ہے۔ لاکھوں طبعی گناہوں، مذموم حرکتوں اور تشدد کے افعال کو لوگ معلوم کرسکتے ہیں اس لئے وہ زیادہ خطرناک نہیں ہوتے بہ نسبت ایک نازک اور روحانی خدا کے تصور کے جسے ایک دلکش نظریاتی لبادہ پہنا دیا جاتا ہے۔ ایک کیتھولک پادری جو نوجوان لڑکیوں کی عصمت دری کرتا ہے وہ کم خطرناک ہے بہ نسبت اس بغیر وردی کے پادری کے جو خدا کے تصور کا پرچار کرتا ہے۔"[4]

---

[1] V.I. Lenin on Religion, P.8

[2] V.I. Lenin Selected Works V.?P.46

[3] V.I. Lenin on Religion, P. 37

[4] V.I. Lenin on Religion, P.38

۱۹۲۶ء کے آس پاس زمانے میں ایک جرمن نومسلم محمد اسد ایک صحافی کی حیثیت سے وسط ایشیا اور روس کا دورہ کر رہے تھے۔ اپنی کتاب (THE ROAD TO MECCA) میں اس دورے کے مشاہدات و تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سوویٹ روس کے بارے میں میرا سب سے پہلا اور دیرپا تاثر وہ ہے جو مرو کے ریلوے سٹیشن پر میرے ذہن میں مرتسم ہوا۔ یہ ایک بہت بڑا پوسٹر تھا جس میں مزدوروں کے یونیفارم میں ایک نوجوان کی تصویر تھی یہ نوجوان ایک سفید ریش اور عبا قبا میں ملبوس شخص کو (جسے ابر آلود آسمان سے نکلتے دکھایا گیا تھا) ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا: "سوویٹ یونین کے مزدوروں نے اسی طرح خدا کو اس کی بلندی سے اتار پھینکا ہے۔" یہ اشتہار سوویٹ یونین کی لادینی انجمن کی طرف سے لگایا گیا تھا۔"[1]

اس طرح کے اشتہارات و اعلانات (جو حکومت کی اجازت کے بعد چھپ سکتے ہیں) ہر جگہ نظر آتے تھے۔ بیک مقامات پر، سڑکوں پر حتٰی کہ بسا اوقات عبادت گاہوں سے متصل چسپاں رہتے تھے۔ ترکستان میں مسجدیں زیادہ ہیں اور انہیں کے ساتھ یہ بے حرمتی ہوتی۔ نماز اگرچہ باقاعدہ ممنوع نہ تھی لیکن لوگوں کو اس سے باز رکھنے کے لئے حکومت ہر ممکن تدبیر عمل میں لا رہی تھی۔ بخارا اور تاشقند میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ خفیہ پولیس کے آدمی مسجد میں آنے والے ہر شخص کا نام بلیک لسٹ میں لکھتے ہیں۔"[2]

مارچ ۱۹۵۵ء میں جب روس نے پہلی مرتبہ اپنا مصنوعی سیارہ خلا میں چھوڑا تھا تو خروشیف نے بیان دیا تھا کہ ہمیں آسمان کے اندر کہیں خدا کا سراغ نہیں ملا۔ خروشیف کے اس الحاد کی مزید وضاحت سوویٹ سائنسز میگزین کے چیف ایڈیٹر نے ماسکو ریڈیو سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے کی۔ مصر کی نامور دینی یونیورسٹی کے آرگن مجلہ "الازہر" کے مرحوم ایڈیٹر احمد حسن زیات نے "سرخ الحاد" کے عنوان سے اپنے افتتاحیہ میں ماسکو ریڈیو کے حوالے سے میگزین آف سوویٹ سائنسز کے چیف ایڈیٹر کے الفاظ حرف بہ حرف نقل کئے ہیں ان کا اردو ترجمہ یہ ہے:۔

---

[1] THE ROAD TO MECCA P.299

[2] THE ROAD TO MECCA P.299

روس کا مصنوعی سیارہ جو حال ہی میں خلا میں چھوڑا گیا ہے اور جو ایسے نازک آلات سے لیس ہے جن میں دیکھنے سننے اور جائزہ لینے کی پوری طاقت موجود ہے اس نے جو خبریں بھیجی ہیں ان میں کوئی ایسی خبر نہیں ہے جس سے مختلف مذہبوں کے اس دعوے کا ثبوت ملا ہو کر آسمان پر کوئی برتر بادشاہ موجود ہے جو تختِ خدائی پر براجمان ہو اور اس کے ارد گرد فرشتے گھیرا باندھے کھڑے ہوں اور اس کے آستانوں کا پیغمبر طواف کر رہے ہوں۔ اور اس کے گوشوں میں جنت اور دوزخ برپا ہوں اور اس کی عدالت سے قضا و قدر کے فیصلے صادر ہو رہے ہوں گویا یہ تصورات محض وہم ہیں اور جہالت نے لوگوں کی عقلوں کے اندر اتار رکھے ہیں۔ یا یہ ایک ڈھکوسلہ ہیں جسے دنیاوی اقتدار کے حریص بطور حربہ استعمال کرتے ہیں۔"[1]

جمہوریہ کارا کے ایک سابق ملا عباس عبداللہ کا مضمون تاشقند کے ایک اخبار میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا: "میں نے اسلام کیوں چھوڑا"۔ یہ مضمون کمیونسٹ دریدہ دہنی کا شاہکار تھا۔ اس کے آخر میں ملا مذکور نے لکھا۔

"خدا کا کوئی وجود نہیں ہے البتہ استحصال پسندوں کے لئے اس کا وجود ضروری ہے۔"[2]

مذہب اور خدا کے بارے میں کارل مارکس۔ لینن۔ سٹالن اور خروشیف کا جو موقف رہا ہے۔ کمیونسٹ لٹریچر اور روسی قلم کاروں کی تازہ بہ تازہ تحریرات سے برابر اس کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔ کریمنز کے کمیونسٹ نے سیف کا ایک مضمون کریمنز ہی کے ایک اخبار میں ۱۷ اپریل ۱۹۶۰ء کو شائع ہوا جس میں مضمون نگار نے خدا پر ایمان لانے کو محض ایک دھوکہ قرار دیا۔

"خدا پر ایمان اور پر مسرت زندگی کا آپس میں کوئی میل نہیں ہے اس لئے خدا پر ایمان نہ لاؤ۔ خدا کا کوئی وجود نہیں یہ محض ایک دھوکہ ہے اس واہمہ کو خیر باد کہو اور نئی پر مسرت زندگی تعمیر کرنے والے باشعور لوگوں کی صف میں شامل ہو جاؤ۔"[3]

باکو کے جریدہ باکنسکی رابوشی (۱۴ اکتوبر ۱۹۵۹ء) میں ایک مضمون نگار نے لکھا۔

"ایک خدا کا تصور ظالم بادشاہوں کے ہاتھ میں مضبوط ہتھیار دے دیتا ہے اگر مشرق میں کوئی ایک بادشاہ نہیں ہوتا تو ایک خدا بھی نہیں ہو سکتا۔"[4]

---

[1] بحوالہ مجلہ الازہر قاہرہ شمارہ اپریل ۱۹۵۹ء [2] پراودا فوستوکا ۳۱ جولائی ۱۹۵۹ء بحوالہ بالا اسلام ص ۱۳۵

[3] فوستوکا تاشقند ۱۲ جولائی ۱۹۵۹ء بحوالہ بالا اسلام ص ۱۳۵ [4] ایضاً

اسلام کے خلاف معاندانہ مہم

لینن کی بن بیاہی بیوی کرپسکا اپنی تصنیف (Memories of Lenin) کے صفحہ ۳۰ پر لکھتی ہے: "لینن کا خیال تھا کہ کوئی مذہب جس قدر غلامانہ ذہنیت اور فضول رسوم سے پاک ہوگا اسی قدر وہ عوام کے حق میں مہلک اور خطرناک ہوگا۔ اس لئے کہ اچھے مذاہب کے اثرات عوام پر بہت زیادہ گہرے ہوتے ہیں"

لینن کے اس خیال کے تحت مجموعۂ مذاہب بالخصوص اسلام کے خلاف ان کا انتہائی سخت اور معاندانہ رویہ قابلِ فہم ہو جاتا ہے۔ مذاہب میں اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو انسان کو ایسی حریت کا درس دیتا ہے جس میں غلامی کا ادنیٰ شائبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں وہ فضول رسوم سے یکسر پاک ہے اس کے دامن میں امن و عافیت اور سکون و اطمینان کی جو دولت پنہاں ہے اس کی کشش لوگوں کو کشاں کشاں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور جو کوئی بھی حلاوت ایمانی کی لذت کو پا لیتا ہے اسلام سے ناقابلِ انقطاع وابستگی اختیار کر لیتا ہے۔

کمیونسٹ اسلام کی اخلاقی و روحانی تاثیر کو ختم کرنے کے لئے اس پر مسلسل سوقیانہ حملے کرتے رہتے ہیں اور اس کو بدنام کرنے کے لئے کسی قسم کی دروغ بافی سے نہیں شرماتے۔ انہوں نے مسلمانوں پر اپنا جُوا مسلط کرنے کے بعد اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم شروع کر دی۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی ساری قوت کا سرچشمہ ان کے اسلامی افکار و عقائد ہیں۔ ضروری ہے کہ انہیں اس سرچشمے سے محروم کر دیا جائے۔ اگست ۱۹۲۲ء میں سوویٹ کمیونسٹ پارٹی نے بارہویں اجلاس میں مذہب دشمن پروپیگنڈا وسیع اور منظم بنیادوں پر شروع کرنے کی قرارداد منظور کی۔ اس حکم پر عمل پیرا ہو کر کمیونسٹ پارٹی۔ اسکولوں کے اساتذہ اور کمسومل (نوجوانوں کی کمیونسٹ تحریک) کے گماشتوں نے بڑے منظم طریقے سے اسلام کے خلاف اپنا کام شروع کر دیا۔ ۱۹۲۵ء میں سوشلسٹ روس میں جمعیت مجاہدین الحاد (Union of Godles Zealots) قائم کی گئی[1] مسلمان ملکوں میں اللہ سیز لر۔ دین سیز لر۔ اور خدا سیز لر کے ناموں سے اس کی شاخیں وجود میں آگئیں اور رفتہ رفتہ اس کے ارکان کی تعداد بڑھنے لگی۔ سارے ملک میں اشاعت و ترویجِ الحاد کی ایک زبردست مہم جاری ہوئی

Julias F, Hacker : Religion under the Soviet, P. 93

مرد، عورتیں، بچے ۔ طلباء۔ فوجی اور غیر فوجی کوئی طبقہ بھی اس سے محفوظ نہ رہا۔ تاہم مذہب کی گرفت ذہنوں پر بڑی مضبوط تھی۔ اس مہم کو وسیع تر اور شدید تر کرنے کے لئے ۱۹۲۹ء میں ایک اور عظیم الشان کانفرنس ماسکو میں منعقد ہوئی۔ جس میں گذشتہ کارکردگی کا جائزہ لیا گیا اور آئندہ کے لئے پالیسی مرتب کی گئی۔ اس کانفرنس میں جمعیت مجاہدین الحاد کا نام بدل کر جمعیت ملحد مبارزین

(Union of Militant Atheieists)

رکھ دیا گیا۔ کانفرنس کے اندازے کے مطابق گذشتہ سات برس میں ملک کے طول و عرض میں جمعیت ملحدین کی ۹ ہزار شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔ اب مذہب دشمن پروپیگنڈہ کو شدید تر کر دینے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء تک اس تحریک کی ستر ہزار شاخیں کام کر رہی تھیں۔ اور باقاعدہ چندہ دینے والے ارکان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی[1]

۱۹۳۶ء میں جریدہ کیزیل ازبکستان نے ایک طویل مقالہ افتتاحیہ لکھا۔ اور اسلام، اسلامی تہذیب ثقافت اور ملی اور قومی روایات کے خلاف وسیع پیمانے پر پروپیگنڈہ کرنے کی شدید ضرورت پر زور دیا۔ چنانچہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں پروپیگنڈے کا ایک نیا طوفان برپا ہوا۔ جمعیت ملحد مبارزین کی شاخیں مسلمانوں کے دل و دماغ میں اسلامی تعلیمات کے خلاف فکری اور نظریاتی زہر بھرنے لگیں ان ملحد سوسائیٹیوں کے ارکان گوناگون مراعات سے نوازے جاتے "تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان میں شریک ہوں ان کے اجلاسوں میں مقالے پڑھے جاتے اور مذاکرات ہوتے۔ پھر ان مقالات اور مذاکرات کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی جاتی۔ اس مہم کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ ۱۹۴۰ء میں پراودا نے اطلاع دی کہ صرف ترکستان میں اس سوسائٹی کی بارہ سو شاخیں تھیں۔ ۱۹۳۹ء میں ان شاخوں کے اجلاسوں میں ۱۵ سو رپورٹیں پڑھی گئیں ۔ اور مذہب دشمن موضوعات پر ایک ہزار سے زائد مذاکرات ہوئے[2]

دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہ مذہب دشمن پروپیگنڈہ اور شدت اختیار کر گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کی خاص کمیٹی برائے عقائد نے ایک قرار داد منظور کی جس میں متوسط طبقے کے عقائد۔ سیاسی شعور اور اصولوں کے فقدان کے خلاف بڑی شدت سے جنگ چھیڑنے کی ہدایت کی گئی۔[3] چنانچہ یہ مہم کمیونسٹ پارٹی کی مختلف

---

۱ Soviet Communism, OP Cit. P. 811 ۲ پراودا ۳۱ مئی ۱۹۴۰ء بحوالہ بالا اسلام ص ۳۴

۳ Smirnow : History of Islamic Studies in U.S.S.R.. P. 248

تنظیموں اور کمسوموں کے سپرد کر دی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں جمعیت برائے نشوونما معارف سیاسی و علمی کے نام سے ایک اور تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کا مقصد دعوتِ الحاد کو نئی زندگی بخشنا تھا۔ ترکستانی جمہوریتوں کے مختلف صوبوں اور اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کر دی گئیں۔ باقاعدہ، ہمہ وقتی اور جز وقتی باتنخواہ لیکچرار مقرر کئے گئے۔ اس سلسلے میں تمام وسائل تحریر و تقریر، ریڈیو اور سینما سے کام لیا گیا[1] ۱۹۴۹ء میں تاشقند میں مذہب دشمنوں کے لئے جدید عجائب گھر قائم کیا گیا[2] اسی سال کرغیزیا میں ۳۱ ہزار لیکچر اور چار ہزار مباحثے ہوئے[3] ۱۹۵۱ء میں ازبکستان میں ۱۰ ہزار اجتماعات ہوئے جس میں دین کے خلاف تقریریں کی گئیں۔ لیکن پروپیگنڈے کی یہ وسعت بھی کمیونسٹ حکمرانوں کے لئے اطمینان بخش نہ تھی۔ اخبارات نے اسے ناکافی قرار دیا۔ اور لکھا کہ عام لوگ بدستور دینی شعائر پر کاربند ہیں[4] ترکمانستان میں ۱۹۵۴ء کے دوران آٹھ ماہ میں تیرہ سو تقریریں ہوئیں جن میں سے سات سو تقریروں میں اسلام پر شدید حملے کئے گئے[5]

۱۹۵۴ء میں تاشقند میں ازبکی مصنفین کے مقالات کا مجموعہ شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا "خرافاتدن معرفتکہ" (خرافات سے معرفت تک) اس پر روسی اخبارات نے بڑے لمبے چوڑے تبصرے کئے اور تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے[6] کیزیل ازبکستان نے ۲۴ ستمبر ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں لکھا کہ گذشتہ چند سالوں کے دوران صرف ازبکستان میں مذہب کے خلاف ۲۰ ہزار کتابیں اور کرا سے شائع ہوئے ان میں اکثر کتابیں روسی کتابوں کے تراجم تھیں۔ جریدہ مذکور نے آخر میں یہ رائے ظاہر کی کہ یہ تعداد ناکافی ہے۔ اور ضرورت ہے کہ اس قسم کی کتابیں مزید شائع کی جائیں[7]

ازبکی اخبارات نے یہ مہم، ۱۹۷۵ء میں بھی جاری کی۔ متعدد مقامات کی ازبکی درسگاہوں کے اساتذہ سے مطالبہ کیا کہ وہ جس مضمون کی تعلیم بھی دیں اس میں ملحدانہ فکر اور پروپیگنڈے نے بنیادی اہمیت دیں اور طلبہ کو اسلام کے غلط تصورات سے آگاہ کریں[8]۔ جن اخبارات نے اس مہم میں کچھ زیادہ سرگرمی کا اظہار کیا

۱، ۲ بالا اسلام ص ۵۴ ۳ سوویتسکایا کیرگیزیا ۲۵ فروری ۱۹۵۰ء فرنز بحوالہ بالا اسلام ص ۵۴

۴، ۵ کیزیل ازبکستان ۸ مارچ ۱۹۵۲ء تاشقند بحوالہ بالا اسلام ص ۵۴ ۶ شرق یلدزی (ستارہ مشرق) عدد ۳ - ۱۹۵۶ء ص ۱۱۹ تا ۱۲۲ بحوالہ بالا اسلام ص ۵۸ ۔ ۷ شرق یلدزی عدد ۷، ۱۹۵۸ء ص ۱۰۶ تاشقند بحوالہ بالا اسلام ص ۵۸ ۸ جریدہ اوکیتوفیشلا جازیتاسی (جریدہ اساتذہ) مارچ ۱۹۷۵ء تاشقند۔ (بحوالہ روس میں مسلمان قومیں)

ان پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ اور انہیں مسلمانوں میں دینی جذبات کی بقا کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ ترکمان کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ترجمان (کمیونسٹ ترکمانستانیا) نے کومسومولٹس ترکمانستانیا" پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:۔

"اس نے سائنٹیفک الحادی تعلیم کی تبلیغ واشاعت میں غفلت برتی ہے یہی وجہ ہے کہ خرزون اور بنیت داغ کی درسگاہوں کے طلبہ پر ابھی تک اہل ایمان کا اثر ہے۔ اور وہ دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے عبادت گاہوں میں جاتے ہیں[1]"

ترکمان کمیونسٹ پارٹی کے اول سکریٹری بابائیف نے فروری، ۱۹۵۷ء میں لکھا۔

"مذہب دشمن پروپیگنڈہ کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ پارٹی کی ذیلی تنظیموں کو اس کام پر ہمیشہ اکساتے رہیں جمہوریہ کے کارکنوں میں دینی زندگی کے اثرات ابھی تک نہایت طاقتور ہیں اور علماء مذہب کی افیون پھیلانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ درحقیقت مذہب دشمن پروپیگنڈہ ضرورت کے مطابق نہیں ہورہا۔ اور یہ اس کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ سوویٹ درسگاہوں میں تعلیم پانے والے بعض نوجوان اسلامی مدارس میں چلے گئے ہیں[2]"

جنوری ۱۹۵۸ء میں ترکمان کمیونسٹ پارٹی کی چودھویں کانفرنس نے باقاعدہ ایک قرارداد منظور کی جن میں ملک کے اندر ملحدانہ پروپیگنڈے کو مزید وسعت دینے کی ہدایت کی گئی[3] جریدہ پراوداوستوکا نے، ۱۰ دسمبر ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں سائنٹیفک الحاد کے داعیوں کو تلقین کی کہ وہ دینی تحریکوں پر ہمہ گیر اور بھرپور وار کریں۔ اس سلسلے میں اس نے تاشقند کی مثال دی جہاں صرف ایک مہینے (جولائی ۱۹۵۷ء) اسلام کے خلاف پندرہ سو تقریریں ہوئیں[4] جنوری ۱۹۵۵ء سے اگست ۱۹۵۷ء تک کے عرصے میں ۸۴ کتابیں ۸ لاکھ کی تعداد میں روس کے مختلف مسلمان علاقوں میں شائع ہوئیں[5]

---

[1] بحوالہ بالا اسلام ص ۵۹ [2] ترکمنا سکرا ۲۷ فروری ۱۹۵۷ء عشق آباد۔ بحوالہ بالا اسلام ص ۵۹

[3] " " ۲ فروری ۱۹۵۸ء " "

[4] Islam in the Soviet Union OP Cit. P. 177

[5]

۱۹۶۰ء کے بعد ملحدانہ پروپیگنڈے میں اور تیزی آگئی جنوری ۱۹۶۲ء سے دسمبر ۱۹۶۴ء تک ۲۱۰ مذہب دشمن کتابیں اور پمفلٹ شائع کئے گئے جن میں خاص طور پر مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا تھا۔ ان میں سے ۴۷ داغستان کی مختلف زبانوں میں۔ ۲۶ ازبک زبان میں۔ ۱۵ قازق میں۔ ۱۴ آذری میں۔ ۱۲ تاجک میں۔ ۹ قازان تاتار میں۔ ۸ کرغیز میں۔ ۷ ترکمان میں۔ ۴ باشکیر میں۔ دو دو کبردا اور شیشان میں۔ اور ایک ایک انجباز۔ کاراکل پاک۔ کراشی اور نوکے میں۔ ۶۰ کتابیں روسی زبان میں شائع کی گئیں جن کے مخاطب صرف مسلمان تھے۔ ان میں سے ۲۷ داغستان میں شائع ہوئیں[1]

اسلام کے خلاف یہ مہم ابھی تک جاری ہے۔ (Nauka-i-Religiya) نے اپنی فروری ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں اطلاع دی کہ شمال مغربی قوقاز کے گاؤں خینز میں مذہبی عبادات اور قدیم رسوم کا قلع قمع کرنے کے لئے چودھریوں کی ایک مجلس قائم کی گئی ہے۔ یہ رسوم اس پرانے گاؤں کی نئی شاندار اور بامقصد زندگی کے مقابلے میں نمایاں طور پر الگ نظر آتی ہیں۔ یہ مجلس مقامی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کی ہدایت پر قائم کی گئی۔

ماسکو لٹریری گزٹ نے ۱۱ جنوری ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں خبر دی کہ سوویٹ ترکمانستان کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ترکمان آبادی میں مذہب دشمن کتابیں بکثرت پھیلانے پر زور دیا ہے۔ مرکزی کمیٹی نے اعتراف کیا کہ پرانے دنوں کی میراث نہ صرف آبادی کے پسماندہ طبقوں میں گہری جڑیں رکھتی ہے بلکہ ان لوگوں میں بھی جن کا کام اپنے مناصب کے پیش نظر دوسرے لوگوں کو تعلیم دینا ہے۔

مسلمانوں کو اسلام سے بیزار کرنے اور ان کے یقین و ایمان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ذہنوں میں کس نوعیت کی زہرافشانی کی گئی۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

ازبک اکاڈمی آف سائنسز کا ایک رکن اے زاہدون اپنے ایک مضمون (The Historical Past of the Uzbak People and Marksi t Leninist Culture) میں لکھتا ہے

"اپنے معاشرتی اور تہذیبی پہلو میں اسلام دنیا کے انتہائی رجعت پسند مذاہب میں سے

ایک ہے اس نے یہ تبلیغ کی کہ مسلمان تقدیر اور اپنے کچلنے والے کے آگے غیر مشروط طور پر سر جھکا دے ہر اصلاح کی راہ میں رکاوٹ ڈالی اور ترکستان کے ارتقا کو روکا ہے[1]

جعفر عباس اوج باتروف نے ۷ جولائی ۱۹۵۰ء کو باکو میں آذربائیجان کمیونسٹ پارٹی کے زیر اہتمام تعلیم یافتہ طبقے کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا :-

"اسلام جملہ غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی عصبیت کا جذبہ رکھتا ہے شروع ہی سے عرب حکمرانوں نے مذہب کی آڑ میں اپنی سلطنت کو وسعت دینے اور دوسری اقوام کو محکوم بنانے کے لئے تلوار اٹھائی۔ ملک گیری کی یہ جنگ "جہاد فی سبیل اللہ" اور غیر مسلم اقوام میں دین حق کی تبلیغ کے بہانے لڑی گئی۔ دوسرے مذاہب کی طرح مسلمانوں نے بھی اپنے پیرؤوں کو تقدیر پرستی اور ظالم حکمرانوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا سکھایا۔ لفظ اسلام کے معنی ہی تسلیم اور اطاعت کے ہیں۔ اور مسلم کے معنی ہیں تسلیم کرنے والا یا اطاعت کرنے والا ایسے ماحول میں اسلام قبول کرنے والے طبقے بالخصوص رجعت پسند اور ملک گیر حکمرانوں کے ہاتھ بہترین آلہ کار بن گئے ہیں"[2]

عشق آباد ریڈیو کے ۱۲ اگست ۱۹۵۴ء کے ایک نشریے میں اسلامی تعلیمات وعبادات پر یوں کیچڑ اچھالی گئی۔

"پسماندہ قوم ہی ان تعلیمات کی پیروی کرتی ہے جن کی دعوت اسلام دیتا ہے۔ ان رسوم کی پابندی سے کسانوں کے روزمرہ کاموں میں حرج واقع ہوتا ہے اور اجتماعی زراعت کے مفاد کو سخت نقصان پہنچتا ہے"[3]

کمیونسٹ پارٹی کے اخبار پراودا نے ۱۲ اگست ۱۹۵۹ء کے شمارے میں لکھا۔

" اسلام استحصال پسندوں کی تخلیق ہے جو انہوں نے محنت کش عوام کو اپنا غلام اور جبر و تشدد کا شکار بنانے کے لئے وضع کیا تھا"[4]

---

[1] کمیونسٹ ازبکستان تاشقند ۲۹ مارچ ۱۹۶۱ء بحوالہ

[2] بحوالہ چراغ راہ (سوشلزم نمبر) ص ۲۹۰ [3] بحوالہ بالا اسلام ص ۵۷ [4] ایضاً ص ۱۳۵ بحوالہ روس میں مسلمان

ایک اور ملحد داعی نے لکھا۔

"اسلام کا قرآن اور اس کی شریعت استحصال پسند گروہوں کی مدح و توصیف کرتی ہے مزدوروں پر ظلم و ستم اور سرمایہ دار طبقے کی خدمت گزاری کی دعوت دیتی ہے اسلام نے ہمیشہ رجعت پسندانہ کردار ادا کیا ہے ..... وہ ترقی پسندی اور علم کا شدید دشمن ہے وہ اپنے متبعین پر جہالت اور غیروں کے صحیح اعتقاد سے ناروا داری اور کفر کے مقابلے میں جہاد مقدس کو فرض قرار دیتا ہے"[1]

سوویٹ انسائیکلو پیڈیا کلاں جلد ۱۸ میں لفظ "اسلام" کے تحت مقالہ نگار لکھتا ہے۔

"دوسرے مذاہب کی طرح اسلام نے بھی مزدوروں کو روحانی طور پر کچلنے کے لئے استحصال پسند طبقات کے ہاتھ میں ایک رجعت پسندانہ ہتھیار کا کام دیا ہے اور غیر ملکی سامراجی اسے مشرقی عوام کو غلام بنانے کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں"[2]

پروفیسر کلیموویش کی حیثیت سرکاری شارح اور ترجمان کی ہے۔ اُسے سوویٹ روس میں اسلام پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ وہ اسلام کے متعلق لکھتا ہے :-

"اسلام ایک غیر سائنسی رجعت پسند عالمی مذہب ہے جو لینن اور مارکس کے سائنسی نظریات سے کوئی مَس نہیں رکھتا۔ اسلام رجائی اور حیات انگیز نقطۂ نظر کا مخالف ہے سوویٹ عوام کے مفادات اس کے ذریعے کبھی حاصل نہیں ہو سکتے"[3]

۱۷ مارچ ۱۹۶۰ء کو آذربائیجان کی مذہب دشمن سوسائٹی کے ایک ممبر عبداللہ بیف کا ایک مضمون باکو کے اخبار میں شائع ہوا۔ جس میں اس نے لکھا ہے۔

"اسلام لوٹ مار اور ظلم و تشدد کو حق بجانب قرار دیتا ہے۔ اور مسلمانوں میں ڈکیتی اور قزاقی کا جذبہ پیدا کرتا ہے"[4]

---

[1] سوویتسکایا کرغیزیا ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۹ء بحوالہ بالا اسلام ص ۱۳۵ [2] سوویٹ انسائیکلو پیڈیا کلاں جلد ۱۸

[3] (بحوالہ چراغ راہ سوشلزم نمبر ص ۲۹۱)

[4] بحوالہ وائس آف اسلام کراچی ص ۱۲۴ - ۱۹۶۱ء

اسلام، اسلامی تہذیب و روایات کے خلاف یہ خونریز جنگ بڑی بے رحمی کے ساتھ جاری تھی کہ دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی اور نازی جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ جرمن افواج طوفان کی طرح بڑھتی اور روسی فوجوں کو شکست پر شکست دیتی چلی گئیں۔ کمیونسٹ روس کو جان کے لالے پڑ گئے۔ یوکرینی اور ایشیائی سپاہی سرخ فوج سے ٹوٹ ٹوٹ کر جرمن فوجوں سے جا ملے۔ بے شمار سپاہی لڑے بغیر ہی قیدی بن گئے۔ کمیونسٹ حکومت نے ایک بار پھر مکر و فریب سے کام لیا۔ بے چین محکوم اقوام کو مطمئن کرنے کے لئے متعدد اقدامات کئے۔ مذہبی آزادی کا اعلان کر دیا۔ علماء اور دوسرے مذہبی رہنما جو انسانی بازوں ، میں تعذیب، اذیت اور قید و بند کی سختیوں کے باوجود زندہ بچ رہے تھے رہا کر دئے گئے جو مسجدیں مسمار یا تفریحی اداروں میں تبدیل ہونے سے بچ گئی تھیں ان میں سے بعض دوبارہ کھول دیں۔ بعض دینی شعائر اور عبادات سے پابندیاں اٹھا لیں۔ مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے نام پر چار ادارے قائم کئے۔ اور ان کے ذریعے مسلمان عوام کی تائید و حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لوگوں سے کہا گیا کہ وہ مسجدوں میں فتح کی دعائیں مانگیں۔ علماء کو مختلف جنگی محاذوں پر بھیجا گیا تاکہ وہ مسلمان سپاہیوں کو نازیوں سے لڑنے کے لئے ابھاریں۔

لیکن جونہی جنگ کا پانسہ پلٹا، کمیونسٹوں نے دوبارہ قبل از جنگ کے شب و روز کی طرف پلٹنا شروع کر دیا حتٰی کہ جنگ ختم ہوتے ہوتے مذہب کے خلاف مہم از سر نو پوری قوت اختیار کر گئی۔

قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف ہرزہ سرائی

جمہوریہ کارا کے سابق ملّا عباس عبداللہ نے اپنے مضمون "میں نے اسلام کیوں چھوڑا" میں قرآن اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف بایں الفاظ ہرزہ سرائی کی۔

"(نبی) محمد (علیہ السلام) ایک فریبی حکمران تھے (معاذ اللہ نقلِ کفر کفر نہ باشد) اپنی شخصیت کو بلند کرنے اور غلاموں کے آقاؤں کی خدمت کے لئے اس عہد کے تمام مذاہب خصوصاً مسیحی مذہب کی تعلیمات کو استعمال کیا..... چنانچہ قرآن اور قوانین شریعت جن پر اسلام کا دار و مدار ہے غلامی اور خواجگی کے قائل، معاشرتی عدم مساوات کے علمبردار اور صریح ظلم و تعدی پر مبنی جنگوں کے حامی ہیں"[1]

[1] پراودا ووستوکا ۳۱ جولائی ۱۹۵۹ء بحوالہ بالا اسلام ص ۱۳۵

پروفیسر کلیموویش محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں لکھتا ہے۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا وجود محض ایک مفروضہ ہے۔"[2]

بطور دلیل وہ یہ دور کی کوڑی لایا ہے کہ وہ تمام مصنفین جنہوں نے آپ کی سوانح حیات لکھی آپ کی وفات کی صدیوں بعد پیدا ہوئے۔ اور یہ ایک تاریخی مفروضہ ہے کہ ہر مذہب کے لئے ایک بانی کا ہونا لازمی ہے۔

قرآن کریم کے متعلق وہ اپنی کتاب (CONTENTS OF QURAN) میں لکھتا ہے۔

" قرآن خالصتاً استحصالی قوتوں (EXPLOITERS) کے مفاد میں ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا اور مظلوم (EXPLAITED) وہ تھے جو تابعداری اور تسلیم و رضا کی بنا پر تسکین قلب کے لئے مستقبل کی آسمانی زندگی پر یقین رکھتے تھے۔ یہ گروہ اس طرح قرآن کی مدد سے استحصال کرنے والوں کا آلہ کار بن کر رہ گیا"[3]

سوویٹ انسائیکلو پیڈیا کلاں میں قرآن کریم کے متعلق لکھا ہے:۔

" قرآن کو استحصال پسند طبقات اور رجعت پسند مسلمان علماء نے مظلوم و مجبور مزدوروں کو گمراہ کرنے کے لئے استعمال کیا ہے"

آذربائیجان کی مذہب دشمن سوسائٹی کے ممبر عبداللہ بیف نے اپنے مضمون میں مزید لکھا:

"قرآن اپنے ماننے والوں کو زندگی کا غلط نظریہ دیتا ہے اور انہیں سوسائٹی میں راحت و مسرت کی زندگی بسر کرنے کی کشمکش میں تنہا کر دیتا ہے۔"[4]

پاکستان کے کثیر الاشاعت اخبار "نوائے وقت" بشمول "ندائے ملت" نے اپنی ۱۹ اگست ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا:۔

"لندن ۱۵ اگست روس کے ضخیم انسائیکلو پیڈیا کے تازہ ایڈیشن میں قرآن مجید پر سوقیانہ حملے برقرار ہیں۔ اس مرتبہ صرف لب و لہجہ میں قدرے نرمی برتی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ" ماوراء الفطرت قانونی و مذہبی عقائد کا مجموعہ ہے اور اس میں

[2] بحوالہ چراغ راہ سوشلزم نمبر ص ۲۶۲

[3] ایضاً

[4] بحوالہ وائس آف اسلام کراچی دسمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۳۴

بہت کم حصے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے (مبارک) دور سے متعلق ہیں؛

روس کے سرکاری ذریعے نے اسلام کے بارے میں لکھا ہے "دوسرے مذاہب کی طرح اسلام نے بھی ہمیشہ رجعت پسندانہ کردار ادا کیا ہے" مثال کے طور پر عرب میں جو طبقاتی معاشرہ اسلام نے تشکیل دیا اس میں استیصال کو سماجی اور اقتصادی مساوات کی آڑ میں جائز ثابت کیا گیا۔ جدید اسلام کے بارے میں اس انسائیکلو پیڈیا میں ان الفاظ میں زہر افشانی کی گئی ہے:-

"بعض مسلمان عذر خواہ اپنے نظریات کے ذریعے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غیر سماجی مصلح ثابت کرتے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ اصل حقیقت پر پردہ ڈالا جائے"

شعائر اسلام کی بابت دریدہ دہنی

جریدہ ترکمنکایا اسکارا نے ترکمانی شعر و ادب میں دین دشمنی کے افکار پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک اداریئے میں لکھا:-

"مشرق کے فاضل دانشوروں مثلاً شاعروں اور فلسفیوں نے اسلام کے تعصب اور کور چشمی پر سخت نکتہ چینی کی۔ شریعت انسان کو جن بھاری زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے انہوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے"[1]

اپنے اس قول کی شہادت میں اخبار مذکور نے ترکمانی شاعر مولا موزا کی مندرجہ ذیل نظم شائع کی۔ جس میں اس نے رمضان کی مذمت کی تھی۔

"بیتے ہوئے زمانے میں قدیم اور پرانے زمانے میں۔ رمضان ملاؤں کے لئے بڑا مرغوب اور فیاض مہینہ تھا؛

اور اب دیکھتے ہو کسانوں پر اس کے حقیقی معنی آشکارا ہو گئے ہیں وہ یہ کہ رمضان مکاروں کی روٹی کا حیلہ تھا۔

اس مہینے میں ملا لوگوں کو نماز پڑھانے کے لئے پکارتا اور اللہ کے نام پر ان سے مال بٹورتا عوام کو لوٹنے کھسوٹنے والے لوگوں کے لئے رمضان گویا ان کے طعام کا مسالا تھا۔

اب اس میں ان کے لئے رغبت کا کوئی سامان نہیں رہا۔ ان کی جمعیت پراگندہ ہو گئی اور

رمضان ملاؤں اور سرمایہ داروں کے لئے آخری دستِ گدائی بن گیا"

اسی طرح ایک اور شاعر شالی کیکیلوف نے عید الاضحیٰ کی مذمت کی اس نے کہا

"چند سال سے نہیں۔ قرن ہا قرن سے یہ عید ہمارے کندھوں پر بارِ عظیم بنی ہوئی تھی۔ اے بھائیو! میرے لئے اس پر صبر ممکن نہ تھا۔

اے عیدِ قربان! ذرا میری بات توجہ سے سُن!!

سرمایہ داروں اور ملاؤں نے غریبوں کو افیون کھلانے کا سامان کیا تھا جس طرح مرغی کے بال و پر نوچے جاتے ہیں اسی طرح وہ غریبوں کے بال و پر نوچا کرتے پھر آج عید منانے کا کیا فائدہ؟

آج ہمارا تجھ کو چاہنا ایسا ہی ہے جیسے ہم طاعون کی تمنا کرنے لگیں۔

اے عیدِ قربان! چلی جا ہم سے دور ——— دور ہو جا"[1]

۱۹۵۵ء میں سوویٹ کمیونسٹ پارٹی نے ہدایت جاری کی کہ مذہب کے خلاف پروپیگنڈے میں ذرا بھی غفلت نہ کی جائے[2] ازبکی شاعر جعفر جولیام نے اس ہدایت کی تعمیل میں ایک نظم کہی جو تاشقند کے اخبارات میں شائع ہوئی۔ شاعر نے کہا:-

"روزے رکھنا چھوڑ دو۔

یہ فریضہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس لئے عائد کیا تھا کہ وہ عرب کے صحرا میں بھوک کا شکار تھے۔

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین بھوکوں کا دین ہے۔

ترقی یافتہ، شکم سیر اور جوان ازبکی عوام کا نہیں"[3]

عیدین کے متعلق عشق آباد کے ایک اخبار نے مندرجہ ذیل گل افشانی کی۔

"یہ ماضی کی ناپسندیدہ باقیات اور مزدوروں کی صحت کے لئے مضر ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ

۱؎ ترکمنکایا اسکارا ۱۰ ستمبر ۱۹۵۲ء بحوالہ بالا اسلام ص ۵۶ ۲؎ مشرق یلدزی (ستارہ مشرق) عدد ۷ - ۱۹۵۸ء ص ۲۶ تاشقند بحوالہ بالا اسلام ص ۵۸ ۳؎ بالا اسلام ص ۱۳۵ حوالہ جات ماخوذ از "روس میں مسلمان قومیں"۔

مزدوروں کو دیہاتوں (علماء) کے مکر و فریب میں پھانسا جاتے۔ مزید برآں یہ تہوار انہیں اپنے کام سے غیر حاضر رکھتے اور ملک کی اقتصادیات کو نقصان پہنچاتے ہیں۔[۱]

ماسکو کے ایک اخبار نے روزہ کے مضر پہلوؤں پر داد تحقیق دیتے ہوئے لکھا۔

"دودھ پلانے والی عورتیں روزے رکھتی ہیں۔ تو دودھ کی کمی کی وجہ سے ان کے بچے مر جاتے ہیں۔ اسکول جانے والے بچوں کو ضعفِ جسمانی لاحق ہو جاتا ہے۔"[۲]

چادر اور چاردیواری کی ہتک

ماں کی گود بچے کی دنیاوی زندگی کا اولین مرحلہ ہے۔ اس عمر میں اس کی لوحِ فطرت بڑی صاف و شفاف اور بلا کی غیر شعوری انفعالی صلاحیت رکھتی ہے۔ آغوشِ مادر کے اس ابتدائی گہوارے میں اس کو جس قسم کی تعلیم و تربیت سے سابقہ پڑتا ہے اس کے اثرات اس کی ذہنیت پر پتھر کی لکیر کی طرح مرتسم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسانوں کی شخصیت اور سیرت و کردار کی تعیین میں زیادہ تر حصہ اسی زمانے کے انداز پرورش کا ہوتا ہے۔ روسی ماہرینِ نفسیات اور مزاج شناس بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے چنانچہ انہوں نے اسلامی اذہان کو بدلنے کے لئے جہاں دوسرے بے شمار خارجی تدابیر اختیار کیں وہاں اس تیر بہدف داخلی تدبیر سے بھی غافل نہ رہے۔ کہ سرے سے مسلمانوں کے منشاء و مولد ہی میں اشتراکی بے حیائی کی وہ فضا پیدا کی جائے جس کی ہوا کھانے والا کوئی بھی مولود عفت نام کی کسی چیز سے آگاہ و شناسا نہ ہو۔

اس غرض کے لئے کمیونسٹوں نے چادر اور چاردیواری کے تقدس کو پامال کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اولاً تو مسلمان عورتوں کو اسلام کی تعلیمات، اس کی تہذیبی اقدار اور معاشرتی روایات سے بیگانہ کرنے اور گھر کی چاردیواری سے باہر کھینچ لانے کے لئے بڑے محتاط اور بے ضرر طریقے اختیار کئے۔[۳] ہر شہر اور قصبے میں کلب گھر کھل گئے۔ جن میں شرکت کے لئے عورتوں کو گوناگوں ترغیبات دی جانے لگیں۔[۴] پہلے

---

۱ ترکمنکایا اسکارا ۲۵ جولائی ۱۹۵۹ء بحوالہ بالا اسلام ص ۱۳۷ ۲ سوویتسکایا روسیا ۴ اگست ماسکو بحوالہ بالا اسلام ص ۱۳۸۔

۳ Dawn over Samarkand OP Cit. P. 288

۴ " " " " " ص ۲۸۸

مسلمان عورتوں کے ذہین طبقے پر دام پھینکا لیکن بمشکل چند تاتاری خواتین ان کا شکار ہو سکیں۔ ان سے مایوس ہو کر مفلس طبقے کی طرف رخ کیا۔[۵] یہاں افلاس بھی تھا اور جہالت بھی۔ کمیونسٹوں نے ان دونوں کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا۔ ایک طرف انہیں اس دامِ تزویر میں مبتلا کیا کہ ہمیں ان کے مذہب، تہذیب اور روایات و رسوم سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم تو صرف ان کی اقتصادی بہبود سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ دوسری طرف انہیں معاشی وسائل فراہم کئے۔ پارچہ بافی کی صنعت میں کام کرنے والی عورتوں کی اجرتوں میں اضافہ کروایا۔ انہیں اچھی روٹی مہیا کی۔ کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اسے کپڑے دیتے۔ عورتوں کی ایک بھاری تعداد اس دامِ زریں میں گرفتار ہو گئیں اور کلب گھروں کی رونق بڑھنے لگی۔ ابتداء میں یہ کلب گھر نہایت بے ضرر اور معصومانہ تھے۔ پہلے انہیں امورِ خانہ داری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بعض کلبوں میں مفت طبی امداد کا انتظام بھی تھا۔[۶] کلب گھر جانے کے لئے پردہ کو خیرباد کہنا ضروری نہ تھا۔ مگر وہاں کی فضا اور ماحول ہی ایسا تھا کہ چند بار کی آمد و رفت کا نتیجہ لازماً بے پردگی کی صورت میں نکلتا تھا۔

کمیونسٹوں کے یہ ہتھکنڈے آخر رنگ لائے عورتوں میں ان کی تحریک تیزی سے پھیلنے لگی اور پھر زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ مسلمان گھروں میں بغاوتِ عام شروع ہو گئی۔ نوجوان عورتیں اور لڑکیاں گھروں سے بھاگ بھاگ کر کمیونسٹوں کی بنا کردہ اقامت گھروں میں پہنچنے لگیں۔ "سوویٹ ایشیا" کا مصنف E.S. BATES مسلمان عورتوں کی بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"پلیناک کا بیان ہے کہ ایک شخص کی بیوی ایک رات اچانک غائب ہو گئی۔ وہ اس کی تلاش میں ادھر ادھر سرگرداں پھرتا رہا۔ آخر ایک قریبی قصبے میں اسے آزاد عورتوں کے درمیان ڈھونڈ نکالا۔ اس نے حکام سے اپنی بیوی مانگی مگر وہاں سے کورا جواب مل گیا۔ چنانچہ اسے بے نیل و مرام گھر جانا پڑا۔ راستے میں وہ ایک دوست کے ہاں شب بسری کے لئے ٹھہرا۔ صبح ہوئی تو اس دوست کی بیوی بھی غائب تھی۔ دونوں نے عورت کا تعاقب کیا اور قصبہ میں پہنچنے سے پہلے ہی اسے جا لیا اور وہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔"[۷]

اس نوعیت کا شدید ردِ عمل اکا دکا ہی رونما ہوتا۔ اکثریت بڑی بے بسی کے ساتھ اپنی

---

۷ حوالہ سابق ص ۱۴۹

عورتوں اور بیٹیوں کو کمیونسٹوں کے دام فریب کا شکار ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ان عورتوں کی تربیت کمیونسٹ خطوط پر کی جاتی۔ تھوڑی ہی مدت میں ان کی کایا پلٹ جاتی حتیٰ کہ گھر والوں کے لئے ان کا پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ اور وہ سرپیٹ کر رہ جاتے۔ جوشوا کونٹز، فوزیہ نامی ایک عورت کا ذکر کرتا ہے جو کمیونسٹوں کے ہتھکنڈوں کا شکار ہو کر گھر سے بھاگ گئی تھی۔ ایک طویل مدت کے بعد اس کی عمر رسیدہ ماں کو خبر ملی تو وہ کمیونسٹوں کے اقامت گھر میں پہنچی۔ اس کے ساتھ فوزیہ کا ایک بھائی بھی تھا۔ انہوں نے فوزیہ کو دیکھا تو

ابتدائی چند لمحے تو وہ دم بخود کھڑے اس کے فرنگی لباس اور تراشے ہوئے بال دیکھتے رہے۔ وہ فوزیہ نہ تھی۔ واقعی فوزیہ اب عملاً ان کی نہ رہی تھی۔ وہ تو اجنبی یا کافر عورت نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں رو پڑے۔ فوزیہ لپک کر ان کے گلے لپٹ گئی۔ انہیں چوما تسلی دی اور خوش آمدید کہی۔ تب جا کر وہ چپ ہوئے رفتہ رفتہ اس کی اجنبی وضع قطع سے ان کی نگاہیں آشنا سا ہوئیں اب انہیں یقین کہ وہ فوزیہ ہی ہے۔ ان کی اپنی فوزیہ جو سارے گاؤں کے نزدیک مر کھپ چکی تھی۔[1]

پھر بوڑھی ماں جذبات کی گہرائیوں سے ابھری اور چلائی۔ آہ! فوزیہ، یہ تم نے کیا کیا؟ مجھے ہر سچے مسلمان کی نظر میں رسوا کر دیا۔ ہر شخص مجھ پر انگشت نمائی کرے گا۔ اب میں کسی سے آنکھیں چار نہ کر سکوں گی...... مشکل کے وقت کوئی میری مدد کو نہ آئے گا۔ کاش میں پرانی زندگی کی تباہی سے پہلے ہی مر جاتی۔[2]

کلب گھروں اور اقامت گھروں کی رونق جیسے جیسے بڑھتی گئی، کمیونسٹوں کے مقاصد بے نقاب ہوتے گئے۔ اب گاہے گاہے پردہ کے خلاف نعرے بھی سنائی دینے لگے۔ ملا جس کی کچھ مدت پہلے توصیف کی جانے لگی تھی۔ ان آزاد بے پردہ عورتوں کی نفرت اور جذبات حقارت کا ہدف بن چکا تھا "پردہ اتار پھینکو" اور "ملا مردہ باد" کے نعرے کلب گھروں ہی میں نہیں جلوسوں کی صورت میں گلی کوچوں میں بھی لگ رہے تھے۔[3] اب کلب گھروں کا ماحول اور مشاغل بھی بدل چکے تھے۔ مسلمان خواتین کو ثقافت کی تربیت دی جا رہی تھی امور خانہ داری کی جگہ راگ رنگ کی مخلوط محفلوں اور کھیل تماشوں نے لے لی تھی گاہے گاہے کلب کے ارکان کو

۱ ۲ ۳ حوالہ سابق ص ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۰

ماسکو اور دوسرے جدید شہروں کا سیر سپاٹا بھی کرایا جاتا۔[1] مرد و زن کے اس آزادانہ اختلاط اور رنگ رلیوں کی فضا نے نگاہ و دل کی عفت، اخلاق و کردار کی پاکیزگی اور شرم و حیا کا جنازہ نکال دیا۔ کمیونسٹ آزادی کے نام پر مسلمان عورتوں کی عصمت سے کھیل رہے تھے۔ وہ عورتیں جو کل تک پاکیزہ اور شریفانہ زندگی بسر کر رہی تھیں اور جن کی طرف کوئی شخص میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکتا تھا۔ اب نہایت بے بسی کے ساتھ کمیونسٹو کی ہوس کاریوں کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھیں۔ ایک (مسلمان) کمیونسٹ عورت ہی کے الفاظ میں

"وہ (روسی) جب عورتوں سے ملتے تو اپنے جذبات قابو میں نہ رکھ سکتے۔ اگرچہ غیر شعوری طور پر ہی سہی، فوراً کھل جاتے اور ایسی حرکتوں پر اتر آتے جو کسی بدکار عورت کے ساتھ ہی کی جا سکتی ہیں۔"[2]

روسی کمیونسٹ افسر تو کسی تکلف کے قائل ہی نہ تھے۔ وہ رانڈ کے سانڈ بنے پھرتے۔ کوئی بے پردہ عورت عصمت کے ان ڈاکوؤں سے محفوظ نہ رہی تھی۔ ای۔ ایس بیٹس (E. S. BATES) کے الفاظ میں۔

"روسی افسر جب کسی بے پردہ عورت کو دیکھتے تو اسے لقمۂ تر سمجھتے۔ گھیر گھار کر مکان میں لے جاتے اور اس کی عصمت دری کر ڈالتے۔"[3]

کمیونسٹوں کی ان سرگرمیوں کا ردعمل شدید اضطراب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ متعدد مقامات پر انہیں اپنے سروں سے محروم ہونا پڑا۔[4] قتل کی ان وارداتوں سے متنبہ ہو کر کمیونسٹ دوبارہ محتاط ہو گئے۔ اولیا آتا میں ایک پرجوش کمیونسٹ عورت کی سرگرمیاں ناقابل برداشت ہو گئیں تو مسلمانوں نے ـــــ جنہیں کمیونسٹ مصنف ملا کہتا ہے ـــــ انقلابی مجلس سے احتجاج کیا اور دھمکی دی ـــــ کہ اگر اس عورت کو گرفتار نہ کیا گیا تو وہ قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ چنانچہ بغاوت اور خونریزی سے بچنے کے لئے محض دکھاوے کے طور پر گرفتار کر لیا گیا۔[4]

ملا اور متدین مسلمانوں کے استیصال کے لئے کمیونسٹ جس مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے وہ ابھی نہیں آیا تھا۔ انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ چندے صبر اور بردباری سے کام لیں۔[5]

۱ حوالہ سابق ص ۲۸۶، ۲۸۷

۲ Soviet Asia P. 149

۳ Dawn over Samarkand OP Cit. P. 281

۴ ایضاً ص ۲۰۷ ۵ ایضاً ص ۲۸۱

بالآخر وہ وقت آہی گیا جب کہ کمیونسٹوں نے کھلے عام اسلامی تہذیب و اقدار کے خلاف ہمہ جہتی جنگ شروع کر دی۔ ۸ / مارچ ۱۹۲۷ء کو بخارا میں ایک بہت بڑی تقریب منعقد ہوئی اور برقعوں کا ڈھیر لگا کر سرِ عام نذرِ آتش کر دیا گیا۔ آنے والے سالوں میں ۸ / مارچ گویا قومی دن بن گیا۔ اور اس روز اس رسم کو باقاعدہ دہرایا جانے لگا۔[1]

وسطِ ایشیا کی تقریباً پانچ ہزار خواتین نے مزاحمت کی اور پردہ ترک کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے اکثر کے برقعے زبردستی چھین لئے گئے۔ اور بقیہ نے اپنے رشتہ داروں کی منت سماجت اور ترغیب و تحریص پر بے پردگی اختیار کر لی۔[2] جبراً پردہ اتارنے کی یہ مہم روسی عورتوں نے انجام دی۔[3]

سوویٹ ایشیا کے مصنف کے بقول یہ عورتیں ہر اس رکاوٹ کو دور کرنے کا تہیہ کر چکی تھیں جو ملاؤں اور مردوں نے کھڑی کر رکھی تھیں اور ایشیائی عورتوں کو تہذیبِ جدید کی راہ پر گامزن ہونے سے روک سکتی تھی۔[4]

ایک عالم تو وہ تھا کہ کمیونسٹ پارٹی اپنی صفوں میں راسخ العقیدہ اور نماز روزہ کے پابند مسلمانوں کو نہ صرف گوارا کرتی بلکہ بڑے بڑے مقامی کمیونسٹ مسجدوں میں باقاعدہ باجماعت نماز پڑھتے تھے۔ اور اب یہ کیفیت کہ اسلام سے وابستگی، اسلامی فرائض کی ادائیگی اور دینی شعائر کا احترام و اہتمام جرم قرار پایا۔ خوقند کے ایک گاؤں کے دس کسانوں کو ایک اجتماعی فارم کی رکنیت سے اس لئے محروم کر دیا گیا کہ وہ مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے۔ خوجہ بخشب نامی گاؤں میں ایک اجتماعی فارم اس بنا پر توڑ دیا گیا کہ اس کے ارکان نے مسجد میں جا کر نماز پڑھنے پر اصرار کیا تھا۔[5] اور اجتماعی فارم سے کسی کو نکال دینے یا اسے توڑ دینے کا مطلب یہ تھا کہ متاثر افراد پر رزق کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو اپنے بیوی بچوں سمیت مر جائیں یا دین کو خیرباد کہہ دیں۔ بخارا کے علاقے میں پارٹی کے ارکان نے اعلان کیا کہ اجتماعی فارموں میں مُردوں کو جلانا لازمی ہو گا۔[6] اب سوشلزم اور ملحدانہ تعلیمات سے ناواقفیت بھی جرم ٹھہری۔ کشکا دریا میں چند کسانوں کو اجتماعی فارم سے اس لئے خارج کر دیا گیا کہ

---

[1] سوویٹ ایشیا ص ۱۴۸ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] Dawn over Samarkand

[6] OP Cit. P. 192

وہ یہ نہ بتا سکے تھے کہ سوشلزم کے کیا معنی ہیں اور ڈارون کب پیدا ہوا تھا۔[1]

کمیونسٹوں نے اپنا لبادۂ فریب بالکل اتار پھینکا تھا۔ وہ نشۂ تند میں بدمست، مسلمانوں کے دین اخلاق سے بے دھڑک کھیل رہے تھے جوشوا کونٹز کی روایت کے مطابق ایک کمیونسٹ شراب کے نشے میں دھت کسانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"ہم نے تمہارے مویشی تو تھیا لئے۔ اب ہم تمہاری بیویوں اور بیٹیوں کو بھی اجتماعی ملکیت میں دینے والے ہیں۔ ہم انہیں اپنے پہلو میں سلائیں گے۔ اور اس طرح ایک دوسرے سے خوب گھل مل کر مکمل کمیون وجود میں لائیں گے۔"[2]

یہ ایک بدمست شرابی کی بڑ نہ تھی بلکہ کمیونسٹوں نے عملاً مختلف مقامات پر کمیون قائم کئے تھے ان کمیونوں کے اجلاس سرخ پرچم کے تلے مسجد کے صحنوں میں منعقد ہوتے تھے۔[3] خاندانی زندگی تلپٹ کر دی گئی۔ پاکیزہ ازدواجی زندگی کی جگہ آزاد ہوس رانی کو مل گئی اور محرم و نامحرم تک کی تمیز اٹھا دی گئی۔ تصدیق کے لئے لینن ہی کی ایک تقریر کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے:۔

"دنیا کے تمام متمدن ممالک میں، اگرچہ وہ بہت زیادہ ترقی یافتہ بھی ہیں۔ عورتوں کا مقام گھر کے ایک غلام سے زیادہ نہیں ہے کسی بھی سرمایہ دار ملک یا زیادہ سے زیادہ آزاد ری پبلک میں عورت پوری طرح سے مساویانہ حقوق نہیں رکھتی۔ سوویٹ ری پبلک کے اہم ترین کاموں میں سے ایک کام یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق پر جو پابندیاں عائد ہیں وہ سب کی سب ہٹا دی جائیں۔ اس وقت تک سوویٹ حکومت نے طلاق کی کارروائی کلیۃً منسوخ کر دی ہے جو ذلت و رسوائی اور ظلم و ستم کا منبع ہے۔ طلاق میں آزادی کے قانون کو پاس کئے ہوئے عنقریب ایک سال ہو جائے گا ہم نے ایک ڈگری صادر کر دی ہے جس کی رو سے حلالی اور حرامی بچوں میں فرق ختم کر دیا ہے اور سیاسی پابندیاں اٹھا لی ہیں۔ دنیا میں اور کسی جگہ بھی مرد و عورت کی آزادی اور مساوات اس طرح سے

قائم نہیں کی گئی ہے۔[1]

مساجد کا انہدام

اسلام، عبادات، معاملات اور اخلاق کے مجموعے کا نام ہے۔ بظاہر یہ تینوں چیزیں اپنی اپنی جگہ پر مستقل اور ایک دوسرے سے الگ دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن درحقیقت باہم مرتبط اور ایک ہی وحدت کے متداخل اجزاء ہیں۔ اہلِ نظر جانتے ہیں، کہ اسلامی زندگی کی تشکیل میں یہ تینوں چیزیں برابر کی حصہ دار ہیں۔ اور ان میں سے کسی ایک کا فقدان اسلامی زندگی کے مطلوبہ آثار و نتائج کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ تاہم عبادات کو اس لحاظ سے اہمیت اور اولیت حاصل ہے کہ یہ خالق کی عظمت اور کبریائی کے احساس و تصور کو بلاواسطہ زندہ اور تازہ رکھتے ہیں۔ جس کی بدولت معاملات اور اخلاق میں بھی اسلامی تقاضوں کی رعایت آسان تر ہو جاتی ہے۔ عبادات میں بھی شریعت نے نماز کو جو مرتبہ اور مقام عطا کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی صحت مند معاشرت کی ضامن اور ان کی ملی شیرازہ بندی میں بنیادی کردار کی حامل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کا حصول جماعت سے وابستہ ہے جس کی جائے اقامت مسجد ہے۔ بنتیجۃً مسجد ہی اسلامی زندگی کے تحفظ کا وہ مرکزی رکن قرار پاتا ہے جس پر حیات آفرین قومی اجتماعیت کا دار و مدار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اعداء اسلام کو اس کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

کمیونسٹوں نے مقبوضہ مسلمان علاقوں میں کتنی مساجد کو بند یا زمین بوس کر دیا اس کا مکمل احاطہ تو مشکل ہے البتہ کچھ اعداد و شمار جو آسانی سے مہیا ہو سکیں وہ یہ ہیں۔ کمیونسٹوں سے پہلے مختلف علاقوں میں مسجدوں کی تعداد مندرجہ ذیل تھی۔

والگا اور اورال	۷۰۰۰
ترکستان	۱۴۰۰۰
قفقاز	۹۰۰۰
جزیرہ نمائے قرم (کریمیا)	۱۰۰۰[2]
	۳۱۰۰۰

[1]

[2] اسلامی صحافیوں کی کانفرنس مؤتمر شیراز کراچی ۱۳ اگست ۱۹۵۶ء بحوالہ بالا اسلام ص ۱۸

سوویٹ وار نیوز (۲۶ مئی ۱۹۴۲ء) کی اطلاع کے مطابق ۱۹۴۲ء میں سارے سوویٹ روس میں صرف ۱۳۱۲ مسجدیں باقی رہ گئی ہیں[1]۔ باقی ساری مساجد یا تو منہدم کر دی گئیں یا انہیں پناہ گاہوں۔ گوشہ ہائے لینن۔ بیٹھکوں اور ریچھ پالوں، سرخ چائے خانوں۔ عشرت کدوں۔ تماشہ گاہوں۔ اسکولوں۔ دار المطالعوں۔ مویشی خانوں اور صحافتی اداروں میں بدل دیا گیا[2]۔ بے شمار مسجدیں گرا دی گئیں۔ ان کی اینٹیں اور پتھر دوسری عمارتوں میں لگا دئے گئے[3]۔ کریمیا میں ۱۹۳۰ء تک ایک مسجد بھی باقی نہ رہی[4]۔ آذربائیجان کے صرف ایک شہر شماخی میں ۱۳ مسجدیں گرا دی گئیں اور ان کے ملبے سے سینما گھر تعمیر کر لیا گیا[5]۔ مسجدیں گراتے وقت کہا گیا کہ لوگ اپنی مرضی سے گرا رہے ہیں۔ اس زمانے میں کمیونسٹ اخبار نے لکھا۔

"عوام نے مسجدوں اور عبادت گاہوں پر حملہ بول دیا ہے۔ ان کی زبان پر یہ نعرہ ہے ہمیں خدا اور اس کے گھروں کی ضرورت نہیں انہیں مسمار کر دیا جائے اور ان کی جگہ اسکول اور جلسہ گاہیں تعمیر کی جائیں[6]۔ حالانکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ یہ انہدام و تخریب زبردستی ہو رہی تھی۔ آذربائیجان کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے صدر ڈاکٹر مجید آفندی زادہ نے صاف الفاظ میں اعتراف کیا کہ سرکاری اخبارات کا دعوٰی صداقت سے عاری ہے۔ مسجدوں کو نہ تو برضا و رغبت گرایا گیا اور نہ بند کیا گیا۔ بلکہ جو کچھ ہوا اس کے پیچھے جبر و تشدد کام کر رہا تھا[7]۔

ماسکو کی جامع مسجد دوسری جنگ سے پہلے تک پبلک ہال کے طور پر استعمال کی جاتی رہی جس میں اسلام کے خلاف لیکچر دئے جاتے اور رقص و سرود کی محفلیں جما کرتیں[8]۔ جمہوریہ تاتاریہ کے شہر منزلہ میں جامع مسجد اسکول میں تبدیل کر دی گئی۔ اور اس کے مینارے پر ہلال کی جگہ سرخ پرچم لہرا دیا گیا[9]۔

[1] بحوالہ وائس آف اسلام کراچی دسمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۲۹ [2] جمہوریہ کنیریل ازبکستان تاشقند ۱۹ اپریل ۱۹۳۰ء بحوالہ بالا اسلام ص ۱۸۰ [3]

[4] مجلہ درجی عدد ۱ ص ۹۲۔ طبع میونخ ۱۹۵۵ء بحوالہ بالا اسلام ص ۷۵

[5] کمیونسٹ ۳۰ دسمبر ۱۹۲۸ء باکو۔ بحوالہ بالا اسلام ص ۷۵ [6] ایضاً ۱۳ فروری ۱۹۲۹ء

[7] " ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۹ء " " [8] بالا اسلام ص ۱۰۷

[9] جریدہ اجنشی قازان ۲۰ نومبر ۱۹۲۹ء بحوالہ بالا اسلام ص ۹۳ (روس میں مسلمان قومیں)

اوفا کے صوبے میں سوویٹ یونین کی دسویں سالگرہ پر چھ مسجدیں، اسکولوں اور جلسہ گاہوں میں بدل دی گئیں۔ اور منطقہ اوفا کی تحصیل ایدنانسک میں پانچ مسجدیں مقفل کردی گئیں[1]۔ انقلاب اکتوبر کی بارہویں سالگرہ پر باشکیریا کے مختلف دیہات میں ۲۳ مسجدیں بند کی گئیں۔ جنہیں بعد ازاں اسکولوں اور جلسہ گاہوں میں بدل دیا گیا[2]۔ یان اورل (اوفا) ۱۹۳۹ء کی روایت کے مطابق باشکیریا کے دارالحکومت اوفا میں مئی ۱۹۲۰ء میں ۱۱ مسجدیں سربمہر کردی گئیں۔ اس وحشیانہ مہم میں کمیونسٹوں نے تاریخی مساجد کو بھی نہ چھوڑا جامع ابزیم کا مینار قازان میں فن تعمیر کا حسین اور دلکش شاہکار تھا۔ فاکیٹوف کے کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کو اکسایا گیا۔ اور ان کے مطالبے پر اس مینار کو گرا کر مسجد کی عمارت میں کارخانہ نصب کیا گیا[3]۔ ۱۹۳۲ء تک سوفرولوفسک اور ولاڈی واسٹک کے درمیانی علاقے میں ایک مسجد بھی باقی نہ رہی[4]۔ تاتاریہ اور باشکیریا میں کل ۸۰۰ مسجدیں منہدم کردی گئیں۔

یہی کچھ کریمیا اور قفقاز میں ہوا۔ ایک سوویٹ مصنف بارانوف نے لکھا کہ باغچی سرائی کے شہر میں جو کریمیا کے مسلمانوں کا دینی مرکز تھا اور جہاں تینتیس مسجدیں تھیں ۱۹۳۵ء میں صرف تین مسجدیں رہ گئیں۔ اور ان میں بھی مٹھی بھر بوڑھوں کے سوا کوئی نمازی نظر نہیں آتا[5]۔ بے شمار مساجد سینما گھروں اور گوداموں میں تبدیل کردی گئیں۔ اور ان کے مینار گرادیئے گئے۔ منہدم کی جانے والی مسجدوں میں دو اہم تاریخی مسجدیں تھیں۔ ایک یوپاتوریا کی جامع "الجمعہ"[6] اور دوسری سمفروپول کی "آق مسجد"[7]

قفقاز میں سوویٹ حکومت نے ۱۹۲۵ء میں ۲۸، ۱۹۲۷ء میں ۳۶، ۱۹۲۸ء میں ۱۱۶ اور ۱۹۲۹ء میں ۲۱۳ مسجدیں سربمہر کردیں۔ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیانی عرصے میں ویران، غیر آباد ہونے اور مقفل کی جانے والی مسجدوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگیا۔ حتی کہ ۱۹۴۰ء تک ان کی تعداد ۳۸۵۰ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۴۱ء تک ۹۶ فیصد مسجدوں کو تالے لگ چکے تھے[8]

---

[1] جریدہ یاما اول ۱۵ نومبر ۱۹۲۹ء اوفا بحوالہ سابق [2] ایضاً ۱۸؍۲۴ نومبر [3] کیزیل تاتارستان ۵ نومبر ۱۹۳۰ء قازان مجموعہ بالاسلام ص ۹۴ [4] مقالہ یوسفو "سائبیریا میں آرتھوڈکس کلیساؤں اور مسجدوں کا انہدام" مجلہ سیر الد عدد ۲-۴-۱۹۵۵ء ص ۱۱۱ تا ۱۱۳ بحوالہ بالاسلام ص ۹۴ [5] بورِیس بارانوف گائیڈ جزیرہ کریمیا ص ۱۱۱ ماسکو ۱۹۳۰ء بحوالہ بالاسلام ص ۱۲۱ [6] کوزیفلی مقالہ اصلاح جامع الخان جزیرہ نمرہ قرم عدد ۵۲-۲۱ جولائی ۱۹۴۳ء بحوالہ بالاسلام ص ۱۲۹ [7] بورِیس بارانوف گائیڈ جزیرہ کریمیا ص ۱۱ ماسکو ۱۹۳۰ء بحوالہ بالاسلام ص ۱۲۹ [8] مرتضاق شالی قفقاز کے باشندے۔ اگست ۱۹۳۰ء بحوالہ بالاسلام ص ۱۱۸ (روس میں مسلمان قومیں)

شعائر اسلام پر پابندی

مسجدیں بند کرنے اور گرانے کے ساتھ ساتھ کمیونسٹوں نے اسلامی شعائر اور مسلمانوں کی دینی زندگی ختم کرنے اور ان کی عملی زندگی کا رشتہ اسلام سے کاٹ دینے کے لئے متعدد اقدامات کئے۔ قانون فوجداری کی دفعہ ۱۲۲ کے تحت بچوں کو اسلامی تعلیم دینے پر سزا کا مستوجب گردانا گیا۔ دفعہ ۱۲۳ کے تحت نماز پڑھنے اور دفعہ ۱۲۶ کے تحت مسجدوں اور مدرسوں کے لئے چندہ جمع کرنے پر پابندی عائد کردی گئی۔ دفعہ ۱۲۵ کی رو سے نکاح کا خطبہ، بچے کی ولادت پر اس کے کان میں اذان و تکبیر کا کہنا، عقیقہ اور ختنہ کرنا اور فطرانہ جمع کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا[1]۔ عید بقر عید کے اجتماع میں شرکت سے روک دیا گیا اور ان دینی تہواروں کی جگہ نئے نئے ثقافتی جشن اور تمدنی میلے منائے جانے لگے[2]۔ قرآن و حدیث اور دیگر دینی کتابوں کی طباعت واشاعت پر پابندی لگادی گئی۔ پہلے قازان اور اوفا میں اور پھر دوسرے شہروں میں تمام چھاپے خانے ضبط کرلئے گئے۔ ایک ایک گھر کی تلاشی لے کر دینی کتابیں جمع کی گئیں اور انہیں الاؤ میں جھونک دیا گیا[3]۔ دینی تعلیم کے حصول یا حج بیت اللہ کے لئے بیرون ملک کا سفر ممنوع قرار دے دیا گیا[4]۔ مسلمانوں کو ان کی روایات سے محروم اور حلال و حرام کے متعلق ان کے احساسات و جذبات کو ختم کرنے کے لئے وسط ایشیا کے تمام ملکوں میں سور پالنا لازمی قرار دے دیا گیا۔ اور اس مقصد کے لئے مسلمان کسان عورتوں کو آلہ کار بنایا گیا۔ کمیونسٹ جریدہ کیزیل تاتارستان مورخہ ۸ مارچ ۱۹۳۰ء قازان نے لکھا:۔

"قبل ازیں تاتاری عورتیں احکام قرآنی کے مطابق سور نہیں پالتی تھیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اب وہ خدا سے بالکل نہیں ڈرتیں۔ وہ فرسودہ اور قدیم خرافات سے آزاد ہو چکی ہیں خدا، انبیاء علیہم السلام، علماء اور جاگیرداران کے مقابلے میں مغلوب ہو گئے ہیں اور سور قرآن پر غالب آگیا ہے۔"[5]

شعائر اسلام کے متعلق کہا گیا کہ یہ متوسط طبقے کو تقویت پہنچاتے ہیں اور انقلاب کے منافی اعمال ہیں۔ ان کا

---

[1] بالاسلام ص ۳۱ [2] ایضاً ص ۳۱ [3] ایضاً ص ۱۳۱ [4] کمیونسٹ عدد ۳۲، ۱۹۲۵ء باکو بحوالہ بالاسلام ص ۶۷ [5] کیزیل تاتارستان بحوالہ بالاسلام ص ۳۵۔ حوالہ جات۔ روس میں مسلمان قومیں سے ماخوذ

قلع قمع کرنے کے لئے حکومت، پارٹی، ثقافتی انجمنوں، قانون اور خفیہ پولیس کی غرض تمام ممکن وسائل سے کام لیا گیا۔ پھر محض پروپیگنڈے اور ترغیب و تحریص ہی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ جبر و تشدد اور ترہیب و تہدید کے حربے بھی استعمال کئے گئے[1]۔ کریمیا کا ترکمان اسماعیل حسن آکین کریمیا میں اسلام اور اسلامی شعائر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"۱۹۳۳ء کے اواخر تک جزیرہ نمائے کریمیہ میں کسی اسلامی و دینی ادارے کا نام و نشان نہ رہا۔ نہ دینی اجتماعات کا قیام ہی ممکن رہا۔ الا یہ کہ چوری چھپے منعقد کیے جاتے۔ ختنہ کی رسم سرکاری طور پر ممنوع قرار دے دی گئی۔ جن لوگوں نے اس رسم کو جاری رکھنے پر اصرار کیا انہیں قید و بند کی سزا بھگتنی پڑی۔ یا انہیں جلاوطن کر کے روس کے دوسرے علاقوں میں بھیج دیا گیا۔ کسی شخص کے لئے کسی دینی فعل پر کاربند رہنا ممکن نہ رہا اس لئے کہ سب خوب جانتے تھے کہ اس کی سزا کیا ہے۔ وہ علماء جو ایک عرصے تک تعذیب و اذیت کا شکار رہنے کے بعد رہا ہوئے۔ انہوں نے اپنے فرائض انجام دینے سے انکار کر دیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ لوگوں کے لئے اپنے مردوں کی تجہیز و تدفین ناممکن ہو گئی۔ وہ اپنے گھروں میں بند دروازوں کے پیچھے نماز پڑھنے پر مجبور ہو گئے۔ مسجدیں بند کر دی گئیں۔ ۱۹۳۴ء میں جب چند بوڑھے مسلمانوں نے سمفر پول کے شہر میں شارع نتر نایا پر واقع مسجد میں نماز پڑھنے کی جرأت کی تو انہیں خفیہ پولیس نے عین موقعہ پر گرفتار کر لیا۔ چنانچہ تمام اسلامی اجتماعات خفیہ طور پر منعقد ہونے لگے"[2]

خود سوویٹ اخبارات بھی اس عینی شاہد کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں کہ کریمیا میں اسلامی احکام و شعائر کی پابندی اور اسلامی عبادات و فرائض کی ادائیگی اور بجا آوری قانوناً جرم تھی[3]۔ ۱۹۳۶ء میں یاطر مصطفےٰ نامی ایک شخص کو تین سال قید بامشقت کی سزا اس لئے دی گئی کہ اس نے اپنے ایک رشتہ دار کا نکاح

---

[1] بینی ملی پول عدد ۱۷ ـ ۱۹۳۰ء ص ۹ - ۱۱ بحالہ بالا اسلام ص ۳۴ [2] اسمٰعیل حسن آکین کی غیر مطبوعہ کتاب "بالشویکی معیبت اور اہل قرم کی اس کے خلاف جدوجہد" حوالہ بالا اسلام ص ۱۳۱ [3] بینی دنیا - ۲۳، ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء، ۶ اپریل ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء یکم اگست ۲۲ ستمبر ۱۹۳۶ء وغیرہ بالا اسلام ص ۱۳۱ (روس میں مسلمان قومیں)

اسلامی شریعت کے مطابق کیا تھا اور ولیمہ کی دعوت دی تھی[1]

دینی مدارس اور علماء کا حشر

کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، اپنی خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتا اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا جب تک اس میں وقتاً فوقتاً ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تنِ مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں۔ اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوت عمل پیدا کر دیں۔

چونکہ اسلام رب تعالیٰ کا آخری دین ہے اور قیام قیامت تک انسانیت کی رہنمائی کا کفیل اور ضامن۔ اس لئے اس کی بقا و حفاظت کے لئے جہاں اور بے شمار انتظامات کئے گئے وہاں اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اس کے اندر وہ اشخاص بھی پیدا کئے جو اس کی عملی صورت کو قائم و دائم رکھیں۔ اور خلقت کے اندر اسلام کے احیاء و تجدید کا ذریعہ بنیں۔

اشتراکی حکومت نے اپنے دائرۂ اختیار میں روشنی کے ان میناروں کو ڈھانے اور اسلام کے ان عملی نمونوں کو مٹانے کے لئے ہر ممکن تدبیر سے کام لیا اور علماء و صلحائے امت کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ پھر اس پر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ تمام مدارس اور تعلیمی و تربیتی مراکز بھی نیست و نابود کئے گئے جہاں ایسے افراد کے نکل آنے کی توقع کی جا سکتی تھی تاکہ اس سلسلے کی جڑیں ہی منقطع ہوں۔ اور پھر کبھی اس کی کوئی کونپل پھوٹ آنے کا اندیشہ تک باقی نہ رہے۔

ترکستان، وادگا۔ اورال اور کریمیا کے علاقوں میں علماء کا صفایا کرنے کی مہم پہلے دن ہی سے شروع کر دی گئی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں بحر ابیض کی نہر کھودنے کا کام جن قیدیوں سے لیا گیا ان کی ایک بڑی تعداد علماء پر مشتمل تھی۔ سوسلیک نامی ایک یوکرینی قیدی جو اس زمانے میں انسانی باڑے میں رہا تھا اپنی سرگذشت میں لکھتا ہے۔

" جو علمائے دین ترکمان اور ازبک کے علاقوں سے آئے تھے وہ اپنے عوام کے مخلص

---

[1] بینی دنیا ۲۲ ستمبر ۱۹۳۶ء بحوالہ سابق

خادم تھے۔ ان کی قوم کے لوگ ان کے ساتھ نہایت خلوص اور احترام قلب کے ساتھ پیش آتے تھے۔ میں نے کسی دوسری قوم کے قیدیوں کو اپنے دینی رہنماؤں کے لئے اس طرح دیدہ و دل فرش راہ کئے نہیں دیکھا۔[1]

۱۹۲۹ء میں یہ مہم پورے عروج پر تھی تاشقند اور دوسرے شہروں میں خفیہ عدالتیں قائم ہو گئیں ان پر عوام دشمن جرائم کے ارتکاب، عوام کو نظام اجتماعی کے خلاف بغاوت پر اکساتے اور قومی جذبات کو ہوا دینے کے جرم میں مقدمے چلائے گئے۔ انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا حق بھی نہیں دیا گیا۔ سوویٹ حکام کے بیان کے مطابق ان مقدمات میں پتہ چلا کہ ملک میں اتحاد اسلامی کے "تباہ کن" تصورات کی جڑیں نہایت گہری ہیں۔ بڑے بڑے جید علماء تختہ دار پر لٹکا دیئے گئے۔ ہزاروں بے سروپا الزامات کی پاداش میں جیل خانوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ دار و گیر روزمرہ کا دستور بن گیا۔[2] جو لوگ پھانسی لگنے سے بچ گئے[3] ان میں سے اکثر قید خانوں اور سائبیریا کے سرد جہنم میں تعذیب و اذیت سے جاں بحق ہو گئے۔ ان میں بڑی تعداد عمر رسیدہ اصحاب کی تھی۔ ۱۹۴۰ء تک پورے سوویٹ روس میں ۵۰ ہزار علماء کمیونسٹوں کی دہشت گردی کا شکار ہو گئے۔[4]

سوویٹ فوجداری قانون کی دفعہ ۵۸ کے تحت علماء، موذنین، خطیبوں، واعظوں اور ائمہ مساجد کے شہری حقوق سلب کر دیئے گئے۔ ان کے راشن کارڈ ضبط کر لیے[5] انہیں غیر عامل طبقہ دے کر ان پر بھاری ٹیکس عائد کر دیئے جن کی ادائیگی ان کی حد استطاعت سے باہر تھی۔[6] انہیں مجبور کیا گیا کہ عالم اسلام سے سوویٹ روس کی تائید و حمایت کی اپیل کریں۔[7]

یہی صورت حال قفقاز اور اورال وغیرہ میں پیش آئی۔ علماء پر ٹیکسوں کا بھاری بوجھ لاد دیا گیا۔ بڑے

---

[1] ر،ل سوسلیک، صفحات سائنسہ لوقائع م تنشر (بزبان یوکرینی) ص ۲۴۳ بحوالہ بالا اسلام

[2]

[3] فاسان جیری جاباجی: کریملین اور اسلام مجلہ آزاد قفقاز عدد ۱۰-۱۳ اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۶ میونخ بحوالہ بالا اسلام ص ۳۲ [4] بالا اسلام ص ۱۳۰ [5] بالا اسلام ص ۶۱

[6] جریدہ زاریا خوستکا ، ۱۰ اگست ۱۹۲۳ء تفلس پراودا ۲۸ دسمبر ۱۹۲۴ء ماسکو بحوالہ بالا اسلام ص ۶۸ - (روس میں مسلمان قومیں)

بڑے علماء موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بے شمار منچوریا اور جاپان کی طرف بھاگ گئے[1] جنہیں بھاگنے یا روپوش ہونے کا موقعہ نہ ملا انہیں کسی قسم کی تحقیقات اور عدالت میں پیش کرنے کا تکلف کئے بغیر گولی مار دی گئی صرف ایدل (والگا) اور اورال کے علاقے میں اٹھارہ ہزار ائمہ مساجد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔[2] تاتاری اور باشکیری علماء کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ ۱۹۳۲ء تک بعض علاقوں میں ایک عالم دین بھی نہ رہا۔[3] ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک کے دوران جب کہ ہر طرف تطہیر عام کا دور دورہ تھا۔ قتل و خون ریزی انتہا کو پہنچ گئی۔ جو شخص بھی خدا کا نام لیوا نظر آیا اسے عوام دشمن اور سماجی قرار دے کر دھر لیا۔[4] جوان اور بوڑھے سب ایک ہی چکی میں پیسے گئے۔ کوئی بھی محفوظ و سلامت نہ رہا۔ کریمیا کا ترکمانی صدر الدین تامالی اسلام اور مسلمانوں کی داستان الم کا ذکر کرتے ہوئے اپنی سرگذشت میں لکھتا ہے۔

"دسمبر ۱۹۳۷ء میں صرف ایک رات میں ۶۰ افراد گرفتار کئے گئے۔ میں خود بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ اس وقت راسو بازار کا قید خانہ علماء سے بھرا ہوا تھا۔ یہ وہ آخری گروہ تھا جو کریمیا میں باقی رہ گیا تھا۔ اکثریت عمر رسیدہ اصحاب کی تھی جن میں شیخ محمد خوجہ احمد وہبی (۸۰ سال) شیخ عبدالمجید (۷۵ سال)، الحاج کفا ور (۸۰ سال) سعید خلیل شلبی اوغلو آفندی (۹۰ سال) ایسے ممتاز اور نمایاں بزرگ تھے۔"[5]

ان علماء میں بے شمار وہ سادہ لوح اور فریب خوردہ اصحاب بھی تھے جو سوشلزم کو محض ایک اقتصادی پروگرام سمجھتے تھے اور جن کا خیال تھا کہ اس اقتصادی پروگرام کے ساتھ ساتھ اسلامی عقائد، نماز روزہ، زہد و تقوای اور دینی زندگی کے رسمی مظاہر بھی چل سکتے ہیں۔ اور ان پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ وہ لوگ بھی تھے جو اسلام کو سوشلسٹ مذہب قرار دیتے اور سوشلزم کی حمایت میں قرآن و حدیث سے استشہاد کرتے تھے۔

کیمونسٹ انقلاب سے پہلے ۱۹۱۱ء میں سائبیریا، ایدل اورال، ترکستان، قفقاز اور دوسرے مسلمان

---

[1] مجلہ یان علی یول عدد ۹، ۱۹۳۷ء ص ۱۱ برلن۔ بحوالہ بالا اسلام ص ۸۵ [2] مقالہ ج فیزولین: ایدل اورال کے مفتی حزمی عدد ص ۱۰۳ میونخ ۱۹۵۱ء بحوالہ بالا اسلام ص ۹۲ [3] بالا اسلام ص ۱۳۰ [4] ایضاً ص ۴۳

[5] مذاکرات تامالی جس کا مسودہ ڈاکٹر اودیچہ کریمال کے پاس موجود ہے۔ بحوالہ بالا اسلام ص ۱۳۱ (روس میں مسلمان قومیں)

علاقوں میں مسلمانوں کے اپنے بیان کے مطابق کل ۲۵۰۰۰ ہزار اور روس کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دس ہزار ابتدائی مکاتب اور ۱۰۸۵۔ اعلیٰ دینی مدارس تھے ترکستان میں ۶۳۰۰۔ ابتدائی اور ۶۰۰ ثانوی اور اعلیٰ دینی مدارس تھے اور صرف ایک شہر بخارا میں چھوٹے بڑے ۲۰۰ مدارس کام کر رہے تھے جن میں ۱۰ ہزار طالب علم پڑھتے تھے[1]۔ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر ان مدارس کا بڑا گہرا اور دور رس اثر تھا۔ کاؤنٹ پاہلن اپنی یادداشت میں لکھتا ہے:۔

ان مدارس میں اسلام کی روحانی بنیادوں، اس کی اخلاقیات اور دنیوی زندگی کے ساتھ اس کے تعلق کی تعلیم ایسے انداز میں دی جاتی ہے جو سارے عالم اسلام میں یکساں اور مشترک ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر ملک کا نوجوان مسلمان ایک واضح اور متعین سانچے میں ڈھل جاتا ہے اس طرح نسلِ انسانی کے ایک بہت بڑے نوجوان نسل کی تشکیل و تعمیر میں یہ مدارس جو مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کا ٹھیک ٹھیک اظہار ممکن نہیں۔ ایک مسلمان بچہ جب مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو اس کا ذہن کوری تختی ہوتا ہے لیکن جب وہ مدرسے سے نکلتا ہے تو ایک ایسے انسانی معاشرے کا رکن بن کر نکلتا ہے جس کے نزدیک خاندانی روایات نسلی بنیادیں، جغرافیائی حد بندیاں الغرض وہ سارے نظریات کوئی حقیقت نہیں رکھتے جو ہماری نظر میں انسان کی تہذیبی نشو و نما کے لئے ناگزیر ہیں۔ اس کی اپنی زندگی عملاً ان نظریات پر مبنی ہوتی ہے جنہیں مدرسے میں متواتر دہرایا جاتا ہے اور جنہیں آنے والے ماہ و سال میں نہایت عزیز رکھا جاتا ہے۔"[2]

یہ درس گاہیں نہ صرف روسی مسلمانوں کے فکر و نظر اور اخلاق و کردار کو ایک خاص ڈھانچے میں ڈھالتیں اور دینی و علمی مراکز کا کام دیتی تھیں۔ بلکہ انہیں سیاسی و فکری قیادت بھی فراہم کرتیں۔ کاؤنٹ پاہلن کے الفاظ میں

" یہ مدارس اسلام کے انتہائی لائق، حوصلہ مند اور مضبوط ارادوں کے حامل عناصر کا مقام

---

[1] میر اسلام (عالم اسلام) مطبوعہ سینٹ پیٹرزبرگ
[2]

اجتماع ہیں یہ لوگ زیادہ تر نوجوان ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں سنت و شریعت کی تعلیم میں کھپا دی ہیں۔ اور جن کے دل پیغمبر[3] خدا کے مقصدِ بعثت کو پورا کرنے کے جوش و جذبے معمور ہیں۔"[1]

کمیونسٹوں نے یہ سب مدارس بند کر دیے۔ اساتذہ گرفتار کر لئے۔ خالی عمارتیں بعض علاقوں میں تو مسمار کر دیں اور بعض مقامات پر ضبط کر کے انہیں چوپالوں، سرخ گوشوں اور مویشیوں کے احاطوں میں تبدیل کر دیں گئے یہی داستان تمام دوسرے علاقوں میں دہرائی گئی۔ تقریباً ۲۵ برس تک کمیونسٹوں کے سائے میں ایک مدرسہ بھی موجود نہ تھا۔ ۱۹۵۲ء میں بخارا کا مدرسہ میر عرب[3] کھولا گیا اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں تاشقند کا مدرسہ بارک خان بھی کھول دیا گیا۔ بعد ازاں اسے دوبارہ بند کر دیا گیا۔ اس وقت سارے ایشیائی روس میں صرف بخارا کا مدرسہ کام کر رہا ہے۔ اس مدرسے میں پانچ سال کا نصاب ہے۔ اس میں صرف وہ طلبہ داخل ہوتے ہیں جو پہلے سات سال تک عام ابتدائی سکولوں میں تعلیم حاصل کر چکتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء۔ ۱۹۵۴ء میں اس مدرسے کے جو اوقاتِ کار تھے ان کے مطابق دینی علوم سے زیادہ غیر دینی علوم پر زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ اور سب سے زیادہ زبانوں کی تحصیل پر۔ نتیجۃً اس مدرسے سے کسی بلند پایہ عالم کا نکلنا ناممکن ہے۔ البتہ سطحی عالم بیشک تیار ہو سکتے ہیں۔ اس مدرسے کے دوبارہ اجراء پر تقریباً ایک ربع صدی کا عرصہ پورا ہو رہا ہے لیکن اس سے آج تک کوئی اسلامی مفکر، محدث یا فقیہ نہیں نکلا۔ یہ حقیقت عملی شہادت ہے اس بات کی کہ مدرسے کا معیار نہایت پست ہے اور اس کا مقصد بس برائے نام قاری خطیب اور مؤذن تیار کرنا ہے۔ تاکہ بوقتِ ضرورت ان سے اپنے اغراض کے مطابق مسلمانوں کی نمائندگی کرائی جا سکے۔

❋

---

[1] اسلاموف "سٹالن اور اسلامی مسئلہ" القفقاس الحرۃ عدد ۱۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میونخ۔ بحوالہ بالا اسلام ص ۱۱۹
[2]
[3] مدرسہ میر عرب کی عمارت سولہویں صدی (۱۵۳۵ء) میں مکمل ہوئی۔ اس مدرسے کا شمار بخارا اور ترکستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے مشہور مدارس میں ہوتا تھا (تاریخ سوویٹ جمہوریہ ازبکستان) (بخارا و سمرقند کی مسجدیں جلد ۱ ص ۴۵۱)

اخلاق کا انکار و تمسخر

لینن کا قول ہے :۔

"ہم ایسے اخلاق کے منکر ہیں جس کی بنیاد سرمایہ داروں نے خدائی احکامات پر رکھی ہو ــــ ہم تمام ایسی اخلاقی اقدار کے منکر ہیں جن کی بنیاد انسانی اور طبقاتی نظریات سے بالاتر ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک فریب ہے۔ اور کسانوں اور مزدوروں کو زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کی خاطر بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہماری اخلاقی اقدار غریبوں کی طبقاتی جدوجہد کے تابع ہے۔ ہماری اخلاقی اقدار کا منبع غریبوں کی طبقاتی جدوجہد کا مفاد ہے ــــــ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ کوئی ایسی اخلاقی اقدار موجود نہیں ہیں جو انسانی معاشرے سے باہر ہوں ــــــ ہمارا اخلاق قلاشوں کی جدوجہد کے تابع ہے اور ان کی جدوجہد کیا ہے؟ یہ جدوجہد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ زار کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے ــــــ ہم یہ کہتے ہیں کہ اخلاق وہی ہے جو پہلے لوٹنے والے معاشرے کو برباد کر دے اور تمام مزدوروں کو محنت کشوں کے گرد متحد کر دے جو نئے کمیونسٹ معاشرے کی تعمیر کر رہے ہیں ــــــ جب لوگ ہم سے اخلاقی اقدار کی نسبت بات چیت کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ایک کمیونسٹ کے نقطہ نگاہ سے اخلاقی اقدار لوٹنے والوں کے خلاف عام جدوجہد اور متحدہ تنظیم پر مشتمل ہیں ہم لافانی اخلاقی اقدار کی نسبت جھوٹی کہاوتوں کو بے نقاب کر دیں گے[1]"

کارل مارکس اور اینگلز کے نظریۂ اخلاق کی توضیح ایک اشتراکی مصنف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتا ہے :۔

"ہم اپنا اخلاقی عمل وضع کرتے وقت الٰہی احکامات کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اور اپنے سامنے صرف انسانی معاشرے میں مزدکی عملی زندگی کو رکھتے ہیں اس راہ میں ہم انفرادیت سے صرف نظر کر کے محض اصول اجتماعیت کو اپناتے ہیں اور انسان کی اجتماعی زندگی، اس کے

ـــــــــــــــ

[1]

باہمی روابط اور پیدائش اشیاء کے دوران میں تمام واقعاتی عوامل کو پیش نظر رکھتے ہیں ہمارے نزدیک کسی اخلاقی ضابطے کی صحت و عدم صحت کا امتحان انسانی معاشرے میں افراد کے روابط و تعلقات کے درمیان ہوتا ہے کہ آیا اس میں کوئی علمی افادیت ہے کہ نہیں[1]"

کمیونسٹ پارٹی کے منشور کا ایک فقرہ یہ ہے :۔

"کمیونزم اخلاقی اقدار کا خاتمہ کرتا ہے۔ مذہب کا خاتمہ کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کو ایک نئی شکل میں پیش کرے اس لحاظ سے کمیونزم تمام تاریخی تجربات کے علی الرغم عمل پیرا ہے[2]"

ایک مشہور کمیونسٹ کا فقرہ ہے :۔

"میرے سامنے اگر ایک طرف اخلاق کو رکھ دیا جائے اور دوسری طرف ایک پاجامہ۔ تو میں پاجامے کو اخلاق پر ترجیح دوں گا[3]"



ـــــــــــــــ

[1]

[2]

[3] کمیونزم یا اسلام از ابو السلام نعیم صدیقی ص ۱۲۔

باب ششم

سوشلزم کی مطلب آشنائی

روسی میں جمہوری حکومت کے بعد وجود میں آنے والی نوخیز مملکتوں کو کچلنے اور ان کی جداگانہ حیثیت کو ختم کرنے کے بعد سوشلسٹوں نے روسی سلطنت کی مزید توسیع کا کام بڑے زور شور سے شروع کیا۔ روس دنیا کا پہلا ملک تھا جس میں کمیونسٹ پارٹی کو اقتدار نصیب ہوا۔ کمیونسٹوں کا نصب العین کمیونسٹ روس نہیں بلکہ کمیونسٹ دنیا تھا۔ مارکسی سائنس کے مطابق تاریخ کے یہ اٹل قوانین ہیں۔ کہ نسلِ انسانی بتدریج مرحلوں سے گزر کر سوشلزم اور سوشلزم کے راستے کمیونزم میں داخل ہوتی ہے۔ لیکن کمیونسٹوں کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ نہیں رہنا چاہئے اور یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان کا کام تاریخ سر انجام دے گی۔ انہیں اپنی تمام تر مساعی اس عمل کو تیز کرنے کے لئے بروئے کار لانی چاہئیں۔

لینن کا بھی ہمیشہ یہی عقیدہ رہا۔ اس کے نزدیک کسی کمیونسٹ کا اس سے بدترین کوئی جرم یا گناہ نہیں ہو سکتا کہ وہ طبعی قوتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے بے عمل ہو کر بیٹھ جائے اس کے خیال میں کسی کمیونسٹ حکومت کا یہ اولین فریضہ ہے کہ وہ عالمگیر انقلاب بروئے کار لانے کی جدوجہد کرے لیکن اس حکومت سے کوئی ایسی حماقت سرزد نہیں ہونی چاہئے کہ اس عالمگیر انقلاب کا بنیادی مستقر (روس) معرضِ خطر میں پڑ جائے۔ روسی کمیونسٹوں کو واضح طور پر روس میں اپنی قوت مجتمع کرنی چاہئے۔ اور روس میں سوشلسٹ نظام قائم کرنا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی انقلابی جدوجہد کی مدد کرنی چاہئے۔

لینن اور اس کے جانشینوں نے اس نظریئے کو روبہ عمل لانے کی پوری پوری کوشش کی۔ انہوں نے اپنے گردوپیش اور دور دراز کے ممالک سے دوستی اور خیر خواہی کے نام پر وسیع اور گہرے تعلقات استوار کئے اور اس کی آڑ میں روسی الحادی نظام لانے کا راستہ ہموار کرنے کے لئے ہر قسم کے سامراجی حربے بے دریغ استعمال کئے۔

پانچ یورپی نوآبادیاں

کمیونسٹ یہ سمجھتے تھے کہ سوشلسٹ انقلاب کے لئے سب سے زیادہ سازگار فضا یورپ میں ہے۔ انہوں نے یورپ میں سوشلزم کی نشوونما سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ لینن کی جانشینی کے ضمن میں سٹالن اور اس کے حریفوں کے مابین جو امور اختلاف کا موجب بنے تھے۔ ان میں سے ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ آیا سوشلزم کسی ایک ملک میں لایا جا سکتا ہے یا نہیں۔

اسٹالن کا نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ سوشلزم صرف سوویٹ یونین میں قائم ہو سکتا ہے لیکن یہ اس وقت تک کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا جب تک کہ اسے اپنے گرد "سرمایہ دارانہ حلقے" سے خطرات لاحق ہوں۔ سوویٹ نظام اسی صورت میں محفوظ ہو سکتا ہے۔ اور سوشلزم کی مکمل فتح کی ضمانت اسی صورت میں مل سکتی ہے جب دنیا کے صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ کئی ملکوں میں سوشلسٹ حکومتیں ہو جائیں۔[1]

اپنے گرد سرمایہ دارانہ حلقے میں سوویٹ نظام کے قیام کے لئے سوویٹ یونین کے ارباب حل و عقد نے کیا کیا؟ اس کی تفصیلات زیر نظر مختصر باب میں نہیں سماتیں۔ ہم سردست نہ تو مکمل سوویٹ تسلط کے دو علاقوں (مشرقی جرمنی اور شمالی کوریا) کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں اور نہ ہی دو ایسے ملکوں (یوگوسلاویہ اور البانیہ) کو بحث و تمحیص کا موضوع بنانا چاہتے ہیں۔ جہاں مقامی کمیونسٹوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہاں ہم صرف

ان پانچ یورپی نوآبادیوں کا تذکرہ کریں گے جہاں کمیونسٹ سوویٹ یونین کی کارروائیوں کی بدولت برسر اقتدار آئے لیکن جہاں آزاد ریاستوں کی کم از کم ظاہری شکل و صورت بحال رکھنے کی کوشش کی گئی۔ یہ پانچ نوآبادیات یا حلقہ بگوش ریاستیں پولینڈ۔ چیکوسلواکیہ۔ ہنگری۔ رومانیہ اور بلغاریہ ہیں۔[1]

کمیونسٹ تسلط کا شکار ہونے سے پہلے ان پانچ ملکوں کے عوام باہمی مماثلتوں کی بجائے باہمی امتیازات کے اعتبار سے زیادہ نمایاں تھے۔ پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور بلغاریہ کے لوگ سلاوی گروپ کی زبانیں بولتے ہیں یہ زبانیں روسی زبان کے بہت قریب ہیں۔ رومانیہ والوں کی زبان پر لاطینی اثرات غالب ہیں اور ہنگری والوں کی زبان یورپ کے کسی بھی حصے کی زبان سے مختلف ہے۔ پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور ہنگری کے لوگ زیادہ تر کیتھولک مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ رومانیہ اور بلغاریہ والے آرتھوڈکس ہیں۔ جب کہ چیکوسلواکیہ اور ہنگری میں معقول پروٹسٹنٹ اقلیت اور بلغاریہ میں خاصی بڑی مسلم اقلیت ہے۔ ۱۹۴۵ء میں چیک علاقے غیر معمولی صنعتی معیشت کے حامل تھے۔ پولینڈ اور ہنگری میں صنعت اور زراعت کو متوازی حیثیت حاصل تھی۔ چیکوسلواکیہ۔ رومانیہ اور بلغاریہ زرعی معیشت کے حامل تھے۔

۱۹۴۵ء سے پہلے مضبوط ترین کمیونسٹ پارٹی چیکوسلواکیہ میں قائم تھی۔ جسے چیکوسلواکیہ کے قریباً نصف محنت کش طبقے کی حمایت حاصل تھی۔ بلغاریہ کی کمیونسٹ پارٹی اگر مختصر اور نشانۂ ستم بنی ہوئی تھی لیکن وہ بڑی منظم اور اس کی قیادت بڑی دلیر اور جرأت مند تھی۔ باقی تین ممالک میں کمیونزم کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔[1]

کمیونسٹوں کا تسلط ——— تین مرحلے

ان پانچ ملکوں میں کمیونسٹ مکمل طور پر ۱۹۴۵ تا ۱۹۴۸ کے درمیانی عرصے میں اقتدار پر قابض ہوئے یہ مکمل تسلط تین مرحلوں میں ہوا۔ پہلے مرحلے میں واقعی مخلوط حکومتیں قائم تھیں۔ جن میں غیر کمیونسٹ پارٹیوں کو تنظیم کی آزادی، بڑی حد تک اظہار رائے کی آزادی اور اپنی پالیسیاں پیش کرنے کی آزادی تھی۔ دوسرے مرحلے میں واقعی مخلوط حکومتوں کی جگہ بوگس مخلوط حکومتیں قائم ہوئیں۔ جن میں غیر کمیونسٹ پارٹیوں کی پالیسیاں

---

[1] ہیوگ سٹین والسن۔ مترجمہ حلیبس عابدی ص ۹۴

اور لیڈران پارٹیوں کے اپنے افراد کی رضا و منشا کے بجائے کمیونسٹوں کی صوابدید کے رہین منت تھے۔ اور ان پارٹیوں کے کسی نوجوان کو کمیونسٹ پالیسی پر تنقید کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس مرحلے میں سوشلسٹ پاکستان پارٹیوں کے ایسے لیڈروں کو اختلاف رائے کا اظہار کرنے یا حکومت کو باہر سے ہدفِ تنقید بنانے کی اجازت تھی جنہیں کمیونسٹوں کی تطہیری مہم کے باعث خود اپنی پارٹیوں سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ تیسرے مرحلے میں غیر کمیونسٹ پارٹیوں کے آثار و باقیات کو یا تو بالکل ختم کر دیا گیا یا کمیونسٹ پارٹی کی ذیلی تنظیم کی شکل دے دی گئی۔ اور حکومت سے باہر ہر قسم کی اپوزیشن کو کچل دیا گیا۔ پولینڈ میں پہلے مرحلے کی نوبت ہی نہیں آئی ۱۹۴۵ء میں یہاں کمیونسٹوں اور معدودے چند واپس آنے والے بے یار و مددگار جلاوطنوں پر مشتمل جو کٹھ حکومت قائم کی گئی تھی وہ دوسرے مرحلے کی حکومت تھی۔ رومانیہ اور بلغاریہ میں پہلا مرحلہ ۱۹۴۵ء کے موسم بہار تک اور چیکوسلواکیہ میں فروری ۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔ ۱۹۴۸ء کے آخر تک یہ پانچوں ملک تیسرے مرحلے میں داخل ہو چکے تھے[۱]

کمیونسٹوں کی کامیابی و کامرانی کے علل و اسباب کا اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو دو وجوہ بڑے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اولاً یہ کہ انہوں نے سول اور ملٹری بیوروکریسی میں کلیدی عہدوں پر بڑے طریقے اور سلیقے سے اپنے آدمی فائز کرائے۔ ثانیاً کہ انہوں نے پرانی حکومت کے افسروں اور اہل کاروں کو رشوت اور "بلیک میلنگ" کے ذریعے اپنے جمہوریت پسند مخالفین کے خلاف اپنا ہمنوا بنایا۔ انہوں نے پولیس (بالخصوص سیکورٹی اور سراغ رسانی کے شعبوں) مسلح افواج (بالخصوص جنرل اسٹاف میں جاسوسی کے محکموں) اور ذرائع ابلاغ (بالخصوص ریڈیو) پر خاص توجہ دی۔ انہوں نے ایسی فیکٹریوں کے انتظام میں بھی اپنے آدمی داخل کئے۔ جو مخلوط حکومتوں کی متفقہ پالیسی کے تحت قومی ملکیت میں لے لی گئی تھیں۔ مزدور تنظیمیں بھی — جنہیں بڑی تیزی سے وسعت دی گئی — کمیونسٹوں کے کنٹرول میں تھیں مجموعی طور پر کمیونسٹ اپنے مخالفوں کی بہ نسبت اقتدار و اختیار کے حقائق اور فوائد کو بہتر سمجھتے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود کمیونسٹوں کو اگر قابض سوویٹ فوجوں کی امداد و اعانت حاصل نہ ہوتی تو انہیں اتنی جلدی کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ کیونکہ متذکرہ صدر پانچ ملکوں میں سے چار ممالک میں انہیں کوئی خاص عوامی حمایت حاصل نہ تھی۔ ان

---

[۱] حوالہ سابق ص ۹۶ - ۹۷

پانچ ملکوں میں جرمن تسلط سے آزادی کے بعد کئی ماہ تک انتشار و افراتفری کی کیفیت رہی۔ اس عرصے میں سوویٹ فوج کے جرنیلوں اور ان کے سیاسی مشیروں نے کمیونسٹوں اور ان کے ہم مشربوں کو کلیدی عہدوں پر فائز کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اور کمیونسٹوں کی پوزیشن مستحکم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کمیونسٹ پارٹیوں کی مالی امداد کی گئی اور انہیں ایسے وسائل و ذرائع مہیا کئے گئے جن کی بدولت وہ مابعد جنگ بے یقینی کی کیفیت سے دو چار لوگوں کو خرید سکیں۔ یا اپنا خیال و ہمراز بنا سکیں۔ جمہوریت کے علمبرداروں کو دھن، دھونس اور دھاندلی سے ہموار کرنے کی کوشش کی گئی اور جو مخالف کسی طرح سے بھی رام نہ ہو سکا اسے جرمنوں کے ساتھ سازباز کرنے کے جھوٹے الزامات اور فرضی مقدمات کا نشانہ بنا کر نیست و نابود کر دیا گیا۔ پولینڈ میں انہوں نے قومی تحریک کے قائدین اور متوسط درجہ کے زعما کو بری طرح کچل دیا۔ رومانیہ میں فروری ۱۹۴۵ء میں سوویٹ وزیر خارجہ اے۔ وائی وشنسکی نے شاہ مائیکل کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے سوویٹ حکومت کی رضا و منشا کے مطابق اپنی حکومت میں تبدیلیاں نہ کیں تو سوویٹ فوجیں کارروائی کریں گی۔ چنانچہ رومانیہ میں ایک ایسی غیر نمائندہ حکومت معرض وجود میں آ گئی۔ جو مکمل طور پر کمیونسٹوں کے کنٹرول میں تھی۔ اسی زمانہ میں بلغاریہ میں سوویٹ فوج کے جرنیل نے کسان پارٹی (ایگریرین یونین) کو اپنے مقبول ترین اور دلیر قائد ڈاکٹر جی۔ ایم دمتروف کو پارٹی سے خارج کرنے پر مجبور کر دیا۔ ہنگری میں فروری ۱۹۴۷ء سوویٹ سیکورٹی فورس نے کسان پارٹی (سمال فارمرز پارٹی) کے ممتاز لیڈر بیلا کوواکس کو گرفتار کر لیا اور جلاوطن کر کے روس بھیج دیا۔ رومانیہ۔ بلغاریہ۔ پولینڈ اور ہنگری میں یہ اقدامات کمیونسٹوں کی مخالفت ختم کرنے میں بڑے ممد و معاون بلکہ فیصلہ کن ثابت ہوئے[۱]

چیکوسلواکیہ کا معاملہ کچھ زیادہ پیچیدہ رہا۔ وہاں سوویٹ فوج نے کمیونسٹوں کو مئی اور دسمبر ۱۹۴۵ء کے درمیان بہت مدد پہنچائی۔ لیکن اس کے بعد سوویٹ فوج وہاں سے چلی گئی۔ مئی ۱۹۴۶ء میں آزادانہ انتخابات الیکشن ہوا جس میں کمیونسٹ سب سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوئے۔ انہوں نے چالیس فیصدی ووٹ حاصل کئے۔ تقریباً دو برس تک ان کا طرز عمل کافی حد تک آئینی رہا۔ چیکوسلواکیہ تیزی سے جمہوری اسٹیٹ بننے لگا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں دو خاص وجہوں سے انہوں نے بحران پیدا کر کے حکومت پر قبضے کا ارادہ کیا اس کا

---

[۱] حوالہ سابق ص ۹۷، ۹۸

ایک سبب تو یہ تھا کہ نیا الیکشن ہونے والا تھا جس میں انہیں پہلے سے کم ووٹ ملنے کی امید تھی۔ دوسری وجہ عام بین الاقوامی صورت حال تھی۔ اسی اثنا میں کمیونسٹوں کے مخالفوں سے تدبیری غلطیاں سرزد ہوئیں جن سے کمیونسٹوں کو سوشل ڈیموکریٹک پارٹی پر تسلط کا موقعہ مل گیا۔ اس کے بعد انہوں نے طاقت کا ہوا کھڑا کر کے صدرِ مملکت ایڈورڈ بنلیز کو مرعوب کیا اور آئینی طریقے ہی سے ایک نئی حکومت قائم کر لی۔ اس بحران کے دوران سوویٹ نائب وزیر خارجہ زورین پراگ ہی میں تھا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ سارا ہنگامہ ماسکو کے اشارے پر ہوا تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں کمیونسٹوں نے مزدوروں کے مسلح دستے بھرتی کر لئے۔ سیکورٹی پولیس پر ان کی گرفت پہلے ہی سے مضبوط تھی۔ اس سے انہوں نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ اس اقدام کو نیم انقلابی اور نیم آئینی کہا جا سکتا ہے اس کی کامیابی کی ایک وجہ تو خود کمیونسٹوں کی کوششیں تھیں لیکن دوسری وجہ روس کی مدد اور رہنمائی تھی۔ جو ۱۹۴۵ء اور اس کے بعد بھی جاری رہی[1]

سوویٹ طرز کا سیاسی نظام

ان پانچ ملکوں میں جو سیاسی نظام قائم کیا گیا وہ سوویٹ یونین کی ہو بہو نقل تھا۔ نئی حکومتوں کو سوشلسٹ ری پبلک کی جگہ "عوامی جمہوریت" کا نام دیا گیا۔ کیونکہ ابھی حکومت اور اقتدار ہی پر قبضہ ہوا تھا۔ سوشلزم کی تعمیر کا کام ابھی باقی تھا۔ لیکن نام کے اس فرق کے باوجود ان ملکوں میں کمیونسٹ پارٹیاں اختیارات کا استعمال بالکل اسی انداز سے کرتی تھیں جس طرح سوویٹ یونین میں انتظامی ڈھانچہ بھی اسی ڈھنگ پر بنایا گیا تھا۔ وزیروں کی مجلسیں، قانون ساز اسمبلیاں عاملانہ بیوروکریسی، قانونی عدالتیں سب کی سب مکمل طور پر پارٹی کی تابع تھیں اس بھرپور کنٹرول کا ذریعہ وہ پارٹی ممبر تھے جو ان اداروں میں اہم عہدوں پر مامور ہوتے تھے۔ فوج اور پولیس کی جمعیت کمیونسٹوں کے ہاتھوں میں کھیلتی تھی۔ پریس، کتابیں اور ریڈیو پارٹی کے لئے پروپیگنڈے کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ ان کی وساطت سے پوری آبادی کو کمیونزم گھول کر پلایا جاتا تھا۔ بچوں کو اپنے والدین سے برگشتہ کرنے اور ان کے ذہن اشتراکی نظریات کے مطابق ڈھالنے کے لئے سکول بہترین سیاسی ہتھیار ثابت ہوئے۔ عیسائی فرقوں اور اسلام کے مابین آویزش کو ناگزیر بنا دیا گیا۔ مذہبی رسوم اور دینی فرائض سرانجام دینے کی اگرچہ اجازت تھی لیکن تعلیمی اداروں سے مذہبی اثرات کو یکسر خارج کر دیا گیا۔ بالغ شہریوں کو مذہب

---

[1] حوالہ سابق ۹۸ - ۹۹

سے بیزار کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ اور ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے۔ کہ لوگوں کے لئے اپنے مذہب کی پیروی مشکل ہو گئی۔ چرچوں کے رہنماؤں پر یہ الزام لگائے جاتے تھے۔ کہ وہ کمیونسٹ نظام کے خلاف سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں کچھ برسرِ عام مقدمے چلے۔ انہیں سزائیں ملیں ان کی مذمت کی گئی۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں ان کے مذہبی عہدوں سے ہٹایا گیا۔ پھر یا تو نظر بند ہوئے یا نگرانی کے مستحق ٹھہرے۔[1]

کمیونسٹوں نے مرکزی معاشی منصوبہ بندی کی طرح ڈالی جس کی بنیاد انہوں نے سوویٹ تجربے پر رکھ لی۔ بھاری صنعتوں کو تقدم کا شرف ملا۔ ان کا بوجھ اٹھانے کے لئے مزدوروں اور کسانوں کو مجبور کیا گیا۔ کہ وہ نہایت معمولی اجرتوں پر کام کریں۔ مزدور تنظیمیں صنعتوں کے لئے افرادی قوت حاصل کرنے اور مزدوروں میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی ذمہ دار تھیں۔ ان کی تنظیم و تشکیل اس طرح عمل میں لائی گئی۔ کہ وہ محنت کشوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ کرنے کے بجائے آجروں کے مفادات کی نگران بلکہ آلہ کار بن کر رہ گئیں۔ مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لئے بڑا لمبا چوڑا نقشہ بنایا گیا لیکن اس کی عملی قدر و قیمت کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے پر منحصر تھی وہی یہ طے کرتی تھی کہ کس وقت مزدوروں کو کتنی آسائشیں بہم پہنچائی جائیں۔ کبھی یہ ہوتا کہ پارٹی فیاضی کے انداز اختیار کر لیتی اور کئی مادی سہولتیں مزدوروں کو دی ڈالتی اور کبھی یہ ہوتا کہ وہ مزدوروں پر زور دیتی کہ کمر کس لیں اور دشوار حالات میں بھی جان توڑ کر کام کریں۔ یہ تو خیر سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کہ ٹریڈ یونینوں یا پارٹی کے لیڈروں پر مزدور کسی قسم کا اثر ڈال سکیں۔ کسان بھاری صنعتوں کے فروغ کے لئے اپنا حصہ اس طرح ادا کرتے تھے۔ کہ وہ زرعی پیداوار کی معینہ مقدار لازمی طور پر حکومت کے حوالے کرنے پر مجبور تھے اس کی جو قیمت انہیں ملتی تھی وہ بہت کم ہوتی تھی بعد میں حکومت ان چیزوں کو صارفین کے ہاتھوں بہت زیادہ نفع لے کر فروخت کر دیتی تھی۔ ۱۹۴۹ء اور اس کے بعد کسانوں پر دباؤ اور بھی بڑھا کہ وہ اجتماعی کھیتوں میں شریک ہو جائیں اس منزل کے حصول کے لئے طرح طرح کے طریقے آزمائے گئے۔ ان میں امتیازی ٹیکسوں سے لے کر جسمانی طاقت کا استعمال اور نارضامند کسانوں کی گرفتاری تک شامل تھے۔ اجتماعیت کے میدان میں ترقی کی رفتار بلغاریہ میں سب سے تیز، اور رومانیہ میں سب سے سست رہی[2]

---

[1] حوالہ سابق ص ۹۶ - ۹۶

[2] 〃 〃 〃 ۱۰۰ - ۱۰۱

قوم پرستوں کی تطہیر اور نوآبادیاتی استحصال

ان پانچ ملکوں کے عوام نہ صرف یہ کہ ایسی حکومتوں کی رعیت بن گئے۔ جو سوویٹ نظام حکومت کی نقل تھیں۔ بلکہ ان کے ملکوں پر سوویٹ یونین کا تسلط بھی قائم ہو گیا۔ وہ سوویٹ یونین کی سیاسی غرض اور معاشی لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو گئے۔ ان کے ملکوں کی مالی وزارتیں، پولیس اور فوج کے محکمے سب سوویٹ یونین کے زیر اثر آ گئے تھے۔ ان میں سوویٹ صلاح کار "مقرر ہوئے جنہیں وسیع اختیارات حاصل تھے۔ جہاں وہ ضرورت سمجھتے بلا روک ٹوک مداخلت کر سکتے تھے۔ ان "مشیروں" میں سے کچھ روسی تھے باقی وہ سوویٹ شہری تھے جو متعلقہ ملکوں میں پیدا ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر ایسے بلغارین ان میں شامل تھے جو اپنی جلاوطنی کی زندگی کے بیس برس سوویٹ یونین میں گذار چکے تھے۔ سب سے نمایاں مثال کانسٹنٹن روکوسووسکی کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ سرخ فوج کا زبردست فوجی لیڈر رہا تھا۔ اس کے ماں باپ پولش تھے۔ ۱۹۴۹ء میں اسے پولینڈ کی وزارت جنگ سونپی گئی۔ اور وہ پولش کمیونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو کا ممبر بن گیا۔ خود کمیونسٹ پارٹیاں ان ملکوں میں سی پی ایس یو (سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی) کے نمونے پر چلتی تھیں۔ ان کی تنظیم وہی تھی۔ کارگزاری کا انداز وہی تھا۔ ان کے ضابطے سی۔ پی۔ ایس۔ یو کے ضابطے کا لفظ بہ لفظ ترجمہ تھے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے آخر میں شخصیت پرستی کا مسلک اپنی انتہا پر تھا۔ ہر ذیلی پارٹی کا اپنا علیحدہ "چھوٹا سٹالن" تھا۔ چیکوسلواکیہ میں گوسوالڈ۔ ہنگری میں راکوسکی۔ پولینڈ میں بیرٹ بلغاریہ میں ڈیمتروف اور اس کے بعد چروان کوف۔ رومانیہ میں جارج جیورجیو دیج سب کا یہی رتبہ تھا۔ ماسکو کی ہدایت پر پارٹیوں کو "صفائی" بھی کرنی پڑتی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں سوویٹ اور یوگوسلاف کمیونسٹوں کے درمیان جھگڑا ہوا جس کے بعد کومن فارم نے مارشل ٹیٹو کو "برادری باہر" کر دیا۔ اس کے بعد ذیلی پارٹیوں میں بھی قوم پرستانہ بے راہ روی کی شدت سے کھوج شروع ہوئی۔ ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا گیا جن کے سر اس انحراف کا الزام رکھا جا سکے۔ ہنگری میں راجک، بلغاریہ میں کوسٹوف، چیکوسلواکیہ میں کلیمنٹس۔ رومانیہ میں پیترش کانو اور پولینڈ میں گومولکا قربانی کے بکرے بنے۔ پہلے چار قتل کر دئے گئے۔ گومولکا خوش قسمت تھا اسے صرف اپنے عہدے سے سبکدوش کیا گیا اور کچھ مدت تک نسبتاً گوارا حالات میں گرفتار رہا۔ اول الذکر چاروں شخصیات کے خلاف جھوٹے مقدمات، کذب و افترا، اور نیم حقائق کا جو حیرت انگیز تار و پود بُنا گیا اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا گناہ صرف یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ملکوں میں سوویٹ تسلط و تصرف

کی کسی حد تک مخالفت کی تھی یا اسے ہدفِ تنقید بنایا تھا۔ ۱۹۴۹ء۔ ۱۹۵۰ء میں قوم پرستوں کی صفائیاں ہوئیں پھر ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء میں صفائی کا سلسلہ مزید چلا۔ چیکوسلواکیہ اور ہنگری میں بڑی سختیاں ہوئیں۔ صفائی کی آفت جن لوگوں کے سر پر آئی ان میں یہودی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ ان پر قیامت خاص طور پر اس لئے ٹوٹی تھی کہ یہودی دشمن تحریک کی زد میں آ گئے تھے جو سٹالن کی زندگی کے آخری سال میں سوویٹ یونین میں چلی تھی۔ اس دور کا سب سے نمایاں ستم رسیدہ چیکوسلاوی کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری جنرل سلانسکی تھا۔ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۳ء کے درمیانی عرصے میں چیکوسلواکیہ اور ہنگری کی کمیونسٹ پارٹیوں کی سنٹرل کمیٹیوں کے نصف سے زیادہ ارکان غائب کر دئے گئے۔[1]

مشرقی یورپ میں سوویٹ یونین کی متذکرہ پانچ نوآبادیات میں جو اقتصادی منصوبے بروئے کار لائے گئے ان کا مقصد یہ تھا کہ ہر ملک صنعت کے ہر شعبے میں زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرے لیکن اس کے ساتھ ہی ہر ملک سوویٹ یونین کا رہینِ منت بھی رہے اور اس کا انحصار مکمل طور پر سوویٹ یونین پر ہو۔ بعض صنعتوں کی مضحکہ خیز حد تک بھرمار کر دی گئی۔ کئی ایسی صنعتیں قائم کی گئیں جن کے لئے حالات اور فضا ساز گار نہیں تھے۔ مثال کے طور پر کئی صنعتوں کے لئے روس کی گراں قیمت مشینری یا خام مال پر انحصار کرنا پڑتا اور اس طرح سے ان صنعتوں سے جو پیداوار حاصل ہوتی وہ اس قسم کی یورپی یا ترقی پذیر ایشیائی ممالک کی بنی ہوئی چیزوں سے کئی گنا مہنگی پڑتی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان ملکوں میں ایسی صنعتیں قائم کی جاتیں جن کے لئے مقامی خام مال یا مقامی محنت کشوں کی صلاحیتوں یا مقامی ذرائع مواصلات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا لیکن کسی نوآبادی میں محنت کشوں کی تخصیص یا مقامی انداز میں سوچنے کا رجحان سٹالن کے لئے کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں تھا۔ وہ اپنے ان نوآبادیاتی ملکوں کو ایک دوسرے کے محنت کشوں کی خام مال یا ذرائع مواصلات سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دینے پر بھی آمادہ نہیں تھا۔ کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ اس طرح ربط و ضبط بڑھے گا یہ ملک ایک دوسرے کے بہت قریب آ جائیں گے۔ اگر وہ اپنی اقتصادی ضروریات باہمی اشتراک و تعاون سے پوری کرنے لگے۔ تو ان پر سوویٹ یونین کی گرفت کمزور پڑ سکتی ہے اگر ان کا روس پر انحصار نہیں ہو گا تو وہ کسی وقت بھی سوویٹ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے

---

[1] ص ۱۰۲، ۱۰۳

سٹالن کا نظریہ یہ تھا کہ ۱۹۳۰ء کے بعد کے برسوں میں وسطی ایشیا کی مملکتوں کی طرح مشرقی یورپ کی نوآبادیات کو بھی ایک دوسرے سے الگ رکھا جائے اور ان کا تعلق صرف ماسکو سے قائم ہو۔ سوویٹ یونین کے ساتھ ان نوآبادیات سے سوویٹ یونین کو جو مال بھیجا جاتا اس کے انتہائی کم دام دیے جاتے۔ اس کے برعکس روسی مال کی بہت زیادہ قیمت وصول کی جاتی۔ اس سلسلہ میں پولینڈ کے کوئلے کی مثال خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ ۱۹۴۵ء میں ڈنمارک نے پولینڈ کا کوئلہ جس بھاؤ خریدنے کی پیش کش کی۔ روس نے اس سے دس گنا کم قیمت پر یہ کوئلہ خریدا۔ پولینڈ کے لئے ڈنمارک کی پیش کش مسترد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بلغاریہ کا خاص عطر — گلاب — سوویٹ یونین نے انتہائی کم قیمت پر خریدا۔ اور پھر سوویٹ حکومت نے یہی عطر دنیا کی منڈیوں میں فروخت کر کے بے حساب نفع کمایا۔ ان ملکوں کی صنعتی ترقی میں سوویٹ یونین کا حصہ صرف وہ کارخانے تھے جو سوویٹ حکومت نے جرمنوں کی ملکیت قرار دے کر ضبط کر لئے تھے۔ ہنگری اور رومانیہ کی حکومتوں نے بھی کچھ کارخانے لگائے۔ کارخانوں کے انتظام کے لئے جو کمپنیاں قائم کی گئیں ان کے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ وہ دونوں ملکوں کے مفاد کو ملحوظ رکھیں گی۔ لیکن درحقیقت اس کا کنٹرول سوویٹ ہاتھوں میں تھا۔ اور سوویٹ حکومت نے یہ انتظام کیا تھا کہ اسے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچنا چاہیے۔ ان نوآبادیات میں دو ملکوں کی ایئر لائنز۔ رومانیہ میں عمارتی لکڑی اور تیل اور ہنگری میں بکسائٹ انڈسٹری کے وسائل بھی تھے اور سوویٹ یونین نے ان سے خوب استفادہ کیا۔ سٹالن کی زندگی کے آخری برسوں میں مشرقی یورپ کے ملکوں پر سوویٹ یونین کے اقتصادی تغلب و تسلط کو معروف مارکسی اصطلاح میں — نوآبادیاتی استحصال — ہی کہا جا سکتا ہے۔



چیکوسلواکیہ کی گوشمالی

روس کی دوستی و آشنائی خصوصاً چھوٹے اور جغرافیائی لحاظ سے اس کے قریب ممالک کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کا چیکوسلواکیہ کے حالات کے آئینے میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک طویل عرصے تک روس کی کفش برداری کرنے کے بعد جب یہاں کے لوگوں نے اس دوست نما بھیڑیے کی خون آشامی سے گھبرا

کر اس کے خلاف آواز بلند کی۔ تو روس نے اسے خاموش کرنے کے لئے نہ صرف یہ کہ دوستانہ اور منصفانہ راستہ اختیار نہ کیا بلکہ خونخواری اور درندگی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ کوئی بدترین دشمن بھی اس پر اقدام کرنے سے ہچکچا جاتا۔

گذشتہ عشرہ کے آخری برسوں میں چیکوسلواکیہ میں اصلاحات کے لئے دباؤ محسوس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے اولین آثار اس وقت ظاہر ہوئے جب سلاوی کمیونسٹوں نے پراگ حکومت کی غیر معمولی مرکزیت کی شدید مخالفت کا اظہار کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں رائٹرز یونین مخالفت کا مرکز بن گئی۔ اسی اثنا میں اقتصادی صورت حال بھی ابتری کا شکار ہو گئی۔ نوکر شاہی کی استبدادی منصوبہ بندی ..... جو زیادہ سے زیادہ مرکزیت کی حامل تھی ..... کے مضر نتائج بھی ظاہر ہونے لگے۔ اقتصادی حالات کی ضرورت کو اگرچہ اصولی طور پر تسلیم کر دیا گیا لیکن انہیں بروئے کار لانے کی جانب کوئی توجہ نہ دی گئی۔

اصلاحات کے علمبردار اس سلسلہ میں یہ دلیل دیتے تھے کہ سیاسی اصلاحات کے بغیر اقتصادی اصلاحات نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوں گی۔ یہ تمام دباؤ ۱۹۶۷ء — ۱۹۶۸ء کے موسم سرما میں کمیونسٹ پارٹی کے اندر اس مطالبہ کی صورت اختیار کر گیا کہ پارٹی کے سربراہ انتونین نووتنی کو الگ کر دیا جائے۔ جنوری ۱۹۶۸ء میں اس کی جگہ نسبتاً غیر معروف سلاوی کمیونسٹ الیگزینڈر دوبچیک نے لے لی۔ آئندہ چند ماہ کے دوران جمہوری آزار کو نمایاں تقویت پہنچی۔ اس تحریک میں دانشور پیش پیش تھے لیکن محنت کشوں نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا سنسر شپ کا خاتمہ ہو گیا۔ گوٹوالڈ کے دور کے چند حقائق منظر عام پر آئے۔ اور ماضی میں چیک اور سلاوی اقوام کی تاریخ کا جو حلیہ بگاڑا تھا اس کا ازالہ کیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کی نئی کانگریس کی تیاریاں کی گئیں اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ اس کانگریس میں ماضی کے لیڈر نظر انداز کر دیے جائیں گے۔ اور ان کی جگہ جمہوری نقطہ نظر کے حامل ایسے نئے آدمی آئیں گے۔ جن کے عزائم اور ارادے کسی کو معلوم نہیں۔ اس کے ساتھ ہی دوبچیک اور اس کے رفقاء نے اگرچہ ان تبدیلیوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا مگر یہ یقین دلانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا کہ کمیونسٹ پارٹی سیاسی اقتدار و اختیار پر اپنی اجارہ داری برقرار رکھے گی اور چیکوسلواکیہ سوویٹ یونین کے ساتھ اپنے اتحاد و اشتراک کا وفادار رہے گا۔[1]

---

[1] نیا سامراج ص ۱۵۵ تا ۱۵۶۔ مصنفہ ہمایوں ادیب۔

اگر سوویٹ لیڈروں کو بنیادی طور پر سوشلزم کے مفادات سے دلچسپی ہوتی تو یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ وہ حالات کو اپنا رخ اختیار کرنے کی اجازت دیتے۔ اور چیکوسلاوی باشندوں کے اس روایتی امتیاز پر اعتماد کر لیتے کہ روس ان کا بہترین دوست ہے چیکوسلواکیہ اور باقی یورپ کے نظریاتی ذہن کے کیمونسٹوں اور سوشلسٹوں کا بھی یہی خیال تھا۔ کہ سوویٹ لیڈر چیکوسلواکیہ پر اعتماد کریں گے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ سوویٹ لیڈروں کی اولین ترجیح کچھ اور تھی۔ اور وہ تھی سوویٹ ایمپائر اور مطلق العنان شہنشاہیت۔ انہیں یہ خطرہ تھا کہ چیکوسلاوی کیمونسٹ پارٹی ان کے قابو میں نہیں رہے گی۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ چیکوسلواکیہ میں حکومت کی اجازت سے غیر کیمونسٹ سیاسی تنظیمیں قائم ہو رہی ہیں۔ انہیں یہ خطرہ تھا کہ اگر کمیونسٹوں کے ہاتھوں سے اصل اقتدار نکل گیا تو حکومت خواہ اس کی قیادت رسمی طور پر کیمونسٹوں کے ہاتھ میں کیوں نہ ہو۔ سوویٹ یونین کے ساتھ اتحاد و اشتراک قائم نہیں رکھے گا۔ غیر جانب داری کے نعرے پہلے ہی لگنے شروع ہو گئے تھے۔ اگرچہ یہ نعرے ایسے افراد کی طرف سے لگائے جا رہے تھے جن کی پشت پر کوئی منظم جماعت نہیں تھی۔ انہیں یہ بھی خطرہ تھا کہ چیکوسلواکیہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے اثرات دوسرے ہمسایہ ملکوں پر بھی پڑیں گے۔ اس سلسلہ میں پولینڈ اور مشرقی جرمنی کے خوفزدہ حکمران سوویٹ لیڈروں کے ہمنوا تھے اسی سال موسم بہار اور اوائل گرما میں پولینڈ اور مشرقی جرمنی کے سفارتی نمائندوں اور اخبارات نے چیکوسلواکیہ کے خلاف خاصی خفگی اور برہمی کا اظہار کیا۔ سب سے زیادہ اعتراضات ماسکو کی طرف سے ہوئے چیکوسلواکیہ کے لوگ جتنے قوم پرست بنتے جاتے تھے۔ دوبچک اور اس کے رفقاء کے لئے لوگوں کے ضبط و تحمل کی تلقین کرنے میں اتنی ہی زیادہ الجھن ہوتی تھی۔ جولائی ۱۹۶۸ء میں سوویٹ اور چیکوسلاوی کیمونسٹ پارٹیوں کے "پولٹ بیورو" کے ارکان کا ایک اجلاس مشرقی سلواکیہ میں ہوا۔ اس کے چند روز بعد پولینڈ، مشرقی جرمنی ہنگری۔ بلغاریہ اور سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹیوں کے لیڈر براتسلاوا میں جمع ہوئے۔ یہ ملاقات اگرچہ خاصے ناخوشگوار تھے لیکن یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ بہر کیف شاید سوویٹ لیڈروں کو یہ یقین ہو گیا کہ دوبچک نے اپنے وعدے کا پاس نہیں کیا یا شاید وہ خود ہی اپنے وعدوں پر قائم نہیں رہنا چاہتے تھے مگر برزنیف نے چیکوسلواکیہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فوجی تیاریاں پہلے ہی مکمل ہو چکی تھیں ۲۰/۲۱ اگست ۱۹۶۸ء کو ایک کثیر فوج نے (جس میں پولینڈ، مشرقی جرمنی بلغاریہ اور ہنگری کے فوجی دستے بھی شامل تھے) چند گھنٹوں میں پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ دوبچک کی حکومت نے مسلح مزاحمت نہ کرنے کا

فیصلہ کر لیا۔ بہر کیف وسیع پیمانے پر عوامی مزاحمت ہوئی جس میں چیکوسلاوی فوج نے عوام کی اعانت کی اور عوامی تحریک مزاحمت کو نشریاتی سہولتیں مہیا کیں۔ سوویٹ لیڈر اس صورتِ حال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ وسیع پیمانے پر خون ریزی کا خطرہ مول لینے کے لئے بھی تیار نہ تھے چنانچہ دوبچک اور اس کے رفقاء کو (جنہیں حملہ کے ابتدائی مراحل میں ہی گرفتار کر لیا گیا تھا اور بڑے وحشیانہ سلوک سے دوچار کیا گیا تھا) رہا کر کے دوبارہ زمامِ اقتدار سنبھالنے کا موقعہ دینے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس کے بعد سوویٹ حکومت نے دو سال کی تخریب و سازش اور دباؤ کے ذریعے چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ پارٹی میں پھوٹ ڈالی۔ اس کے انتہائی سرگرم ارکان کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ ہزاروں چیک باشندوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ سینکڑوں افسروں اور اہل کاروں کو ملازمتوں سے الگ کر دیا گیا اور پورے ملک پر ہراس اور وحشت طاری کر دی گئی۔ ۱۹۷۰ء کے آخر تک سنسر کی پابندیاں پوری سختی سے عائد کر دی گئیں تاریخ پھر مسخ ہونے لگی اخبارات پھر پرانے دور کے جھوٹ گھڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اور ماسکو کی خوشامد پھر روزمرہ کا معمول بن گئی[1]

چیکوسلواکیہ پر حملہ ایک پرانے نظریہ کی تجدید کا موجب بنا۔ سٹالن نے کہا تھا کہ تمام کمیونسٹوں کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سوویٹ یونین کی حفاظت کو مقدم سمجھیں۔ برزنیف نے یہ اعلان کیا کہ سوشلزم کو جب کبھی خطرہ لاحق ہو تو تمام سوشلسٹ ملکوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس سوشلسٹ حکومت کی امداد کریں جسے خطرہ لاحق ہوا ہے اور ایسی امداد کے لئے کسی استدعا یا اپیل کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے بلکہ سوشلسٹ ملکوں کو از خود حرکت میں آجانا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ سوویٹ حکومت کسی وقت بھی اپنی فوج یا مشرقی یورپ کے ملکوں کی فوجوں کو کسی ایسے کمیونسٹ ملک پر حملہ کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔ جس کی پالیسیاں سوویٹ یونین کو پسند نہ ہوں۔ کیونکہ یہ فیصلہ تو بہر حال سوویٹ یونین ہی کرے گی۔ کہ کس ملک میں سوشلزم کو خطرہ لاحق ہوا ہے[2]

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ وسطی یورپ میں ۱۹۷۰ء تک ایک سوویٹ ایمپائر معرضِ وجود میں آچکی تھی۔ اس ایمپائر کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی ہے۔ اور نفرت کرنے والوں میں تمام محکوم اقوام کی کمیونسٹ

---

[1] نیا سامراج از ہمایوں ادیب ص ۱۵۶، ۱۵۷ [2] ایضاً ص ۱۵۸، ۱۵۹

پارٹیوں کے کئی ارکان بھی شامل ہیں۔ چیک قوم کو روسیوں سے واقعی محبت تھی لیکن ۱۹۶۸ء کے حملے نے اس محبت کو نفرت میں بدل دیا۔ سوویٹ لیڈر ۱۹۴۵ء کے بعد اگر مشرقی یورپ میں کسی وقت بھی محض بالادست پوزیشن حاصل کرنا چاہتے تو وہ نہ صرف مغربی طاقتوں بلکہ وسطی یورپ کی اقوام کی رضا و منشا سے بھی ایسا کر سکتے تھے۔ لیکن سوویٹ لیڈروں کو یہ روایتی سامراجی پوزیشن منظور نہیں تھی وہ چند قدم آگے جانا چاہتے تھے وہ ان علاقوں کی اقوام کا استحصال کرنا چاہتے تھے ان کی قومی تذلیل کے درپے تھے اور ان کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانا چاہتے تھے ان کی تاریخ کو مسخ کرنے ان کی تہذیب و ثقافت اور ان کی قومیت تباہ کرنے میں تسکین و مسرت محسوس کرتے تھے۔ سوویٹ پالیسی قدیم استعماریت سے بھی بدتر ہے۔ یہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے سامراج سے بھی بدتر ہے۔ انگریز اور فرانسیسی اپنے محکوموں کو دوسرے درجہ کے شہری متصور کرتے تھے لیکن انہوں نے اپنے محکوموں کا کوئی تشخص ختم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے برخلاف روس کا نیا سامراج مفتوح اقوام میں ان کی قومی خودی کی ادنیٰ رمق بھی برداشت نہیں کرتا ہے۔

ایران میں اثر و نفوذ

محکوم قوموں کے استحصال، زیردستوں پر ظلم و ستم، محکموں کے بنیادی انسانی حقوق کی پامالی، شہری آزادیوں پر پہرے، جبر و استبداد الغرض کسی بھی اعتبار سے پرکھا جائے۔ سوویٹ یونین ایک استعماری و سامراجی طاقت نظر آتی ہے۔ یہ "سوویٹ امپیریلزم"۔ "سرخ سامراج" یا "سوشل سامراج" اس لحاظ سے استعماریت کی ایک جدید اور نئی شکل ہے کہ ایک سفید فام (روسی) قوم اشتمالیت اور اشتراکیت (سوشلزم اور کمیونزم) کے نام پر دوسری اقوام کی جمہوری امنگوں اور قومی آرزوؤں سے ہمدردی جتا کر اور بسا اوقات ان کی مؤثر امداد و اعانت کے ذریعے اپنے تسلط و تغلب کو فروغ دیتی ہے۔ اس کے ترکش کا انتہائی کارگر تیر سوشلزم اور کمیونزم ہے اور اسی مؤثر ترین حربے کے ذریعے وہ ساری دنیا پر چھا جانے کے دیرینہ خواب کی تکمیل کر رہی ہے۔ اسے اگر اپنے وسیع تر مفادات اور مستقبل کی اغراض کے لئے دنیا کے بعض علاقوں میں اشتراکیت کی مخالفتوں کو ختم کرنے کے لئے اپنے نظریات اور اصولوں میں ترمیم بھی کرنی پڑے تو وہ اسے بھی گوارا کر لیتی ہے اور اسلامی سوشلزم یا عرب سوشلزم یا کسی اور قومی سوشلزم کا نعرہ بھی قبول کر لیتی ہے۔ اور اسے ہرگز مارکس اور لینن کے اصولوں کے منافی قرار نہیں دیتی۔ ایران میں مارکسی اسلام یا اسلامی مارکسزم بھی اسی توسیع پسندی

کی ایک کڑی تھی۔

مغرب نواز خود مختار ملکوں میں روس ایک زوردار پروپیگنڈے سے وہاں کے حکمرانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان ملکوں کے ایسے تاجر جن کے امریکہ یا مغربی ملکوں کے ساتھ کاروباری روابط ہوتے ہیں - انہیں رجعت پسند اور امریکی اور مغربی سامراج کے کارندے قرار دیا جاتا ہے۔ جو لوگ مغربی کاروباری مفادات کا مقابلہ کرتے ہیں انہیں "مقامی بورژوا" کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ سوویٹ لیڈروں کے نزدیک معیار محض ان ملکوں کی خارجہ پالیسی ہے وہ ان ملکوں کے مقامی حکمرانوں تاجروں اور صنعت کاروں کے مابین دوسرے تمام امتیازات (مثلاً ان میں غربت و امارت کا فرق و امتیاز نیز اس امر کا لحاظ کہ ان میں سے اپنی رعایا اور محنت کشوں یا ماتحتوں کے ساتھ اچھا سلوک کون کرتا ہے یا برا سلوک کس کا ہے) یکسر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ ان ملکوں میں امریکی پالیسی کی وجہ سے آمریت قائم ہو گئی ہے۔ بہرکیف اگر کسی ملک میں واقعی آمریت کارفرما ہو اور امریکہ اس کی مخالفت کا اظہار کرے تو اسے سامراجی مداخلت کا نام دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وینزویلا میں جنرل پیریز جیمنز کے مظالم کو امریکہ سے منسوب کیا گیا لیکن جب ۱۹۴۶ء میں امریکی سفیر متعینہ بیونس آئرز نے آمر مطلق جان پیرون پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تو اسے ارجنٹائن کے معاملات میں امریکی مداخلت کا نام دیا گیا۔ جب جنرل پیریز کا تختہ الٹ دیا گیا تو ابتداً کمیونسٹ بڑے خوش ہوئے لیکن جب جمہوری پارٹی کے قائد رسولو بتیان کورٹ صدر بنا اور امریکہ کے ساتھ دوستی کی پالیسی اختیار کی نیز صحیح معنوں میں جمہوریت کی سربلندی کا اہتمام کیا تو ماسکو نے اسے امریکی پٹھو قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی۔[1]

دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر سوویٹ یونین وہ واحد بڑی طاقت تھی جس کی حدود میں توسیع ہوئی۔ مغربی یورپ کی سامراجی سلطنتوں اور امریکہ نے (فلپائن میں) دنیا کی ساٹھ کروڑ آبادی کو آزادی سے ہمکنار کیا لیکن سوویٹ یونین نے اپنی فتوحات کے علاوہ مشرقی یورپ کے دس کروڑ باشندوں پر تسلط و تغلب حاصل کر لیا۔ ۱۹۴۵ء میں سوویٹ حکومت نے ایران کے شمال مغربی سرحدی صوبہ آذربائیجان (جس کی سرحدیں روسی آذربائیجان سے ملتی ہیں) میں کمیونسٹ حکومت قائم کر دی۔ اور کردوں کی خود مختاری کی بھی حمایت کی اس وقت سوویٹ فوجیں امریکی و برطانوی اتحادیوں کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت ایران میں گذشتہ چار

---

[1] نیا سامراج ص ۱۷۷، ۱۷۸

سال سے موجود تھیں۔ ایک سال بعد جب روسی فوجوں کی واپسی ہوئی تو کیمونسٹ حکومت بھی ختم ہو گئی۔ البتہ لاکھوں ایرانیوں کے دلوں میں ان کیمونسٹ حکمرانوں کی تلخ یادیں محفوظ رہیں۔ روسی فوجوں کا یہ انخلاء (جو امریکی دباؤ کی وجہ سے بروئے عمل آیا) ۱۹۴۵ء کے بعد کیمونسٹ تاریخ کا واحد واقعہ ہے جس میں ماسکو حکومت کسی ایسے علاقے سے دست بردار ہوئی جہاں کیمونسٹ حکومت قائم ہو چکی ہو۔ چھ سال بعد کیمونسٹوں کے لئے ایک اور موقعہ پیدا ہوا جب ڈاکٹر مصدق کی انتہا پسند قوم پرست حکومت نے اقتدار سنبھالا۔ ڈاکٹر مصدق تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لینے کے مسئلے پر مغربی ملکوں سے بالعموم اور برطانیہ سے بالخصوص بُری طرح اُلجھ گئے۔ اور آویزش و تصادم کی صورت پیدا ہو گئی۔ لیکن ڈاکٹر مصدق اور ایرانی کیمونسٹوں (تودہ پارٹی) کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں تھا۔ لہٰذا ان میں کوئی اشتراک و الحاق نہ ہو سکا۔ اگست ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق معزول ہوئے تو کیمونسٹ (شہنشاہ ایران کو قتل کرنے کی ناکام کوشش کے بعد ۱۹۴۹ء میں کیمونسٹوں پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں لیکن ۱۹۵۲ء کے خلفشار میں وہ دوبارہ ابھر آئے تھے) ایک بار پھر زیر زمین جانے پر مجبور ہو گئے۔ اس صدی کے چھٹے عشرے کے آخری برسوں میں معاندانہ سوویٹ پروپیگنڈا اور زیر زمین کیمونسٹوں کی سرگرمیوں میں ایک بار پھر شدت آگئی۔ اور نہ صرف مغربی ملکوں کے خلاف قوم پرستانہ جذبات نیز آمرانہ حکومت اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف مایوسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی۔ بلکہ ایرانی دانشوروں اور ذہین طبقہ کو یہ یقین دلانے کی بھی سعی کی گئی۔ کہ ان کے تمام مصائب و آلام کی وجہ امریکہ ہے۔ اور اگر ایران غیر جانب دار ہو جائے تو حالات سدھر سکتے ہیں۔ ایران کے بارے میں سوویٹ پالیسی کا مقصد چنداں ناقابلِ فہم نہیں بمقصد فقط یہ تھا کہ پہلے ایران کو مغرب سے الگ کیا جائے اس کے بعد غیر جانب دار ایران کو سوویٹ یونین کی نوآبادی بنا دیا جائے تاکہ سوویٹ یونین کو خشکی کے راستے نہ صرف خلیج فارس بلکہ دنیائے عرب اور عربوں کے ذریعے افریقہ تک رسائی حاصل ہو جائے۔ بہر کیف ۱۹۶۰ء کے بعد کے برسوں میں جب مصر اور دوسرے عرب ملکوں میں سوویٹ اثر و نفوذ غیر معمولی طور پر بڑھ گیا تو ماسکو حکومت کے نزدیک ایران کی زیادہ اہمیت نہ رہی۔ سوویٹ یونین نے ایران پر اپنا دباؤ کم کر دیا۔ اور دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات درست ہو گئے۔ بلکہ دونوں ملک وقتاً فوقتاً سرکاری طور پر خیر سگالی کا اظہار بھی کرنے لگے۔ اس وقت سوویٹ یونین کا خیال تھا کہ عرب ملکوں پر زیادہ توجہ دی جائے کیونکہ اگر عرب ملکوں کو سوویٹ یونین کی نوآبادی بنا لیا گیا تو پھر ایران کو زیر کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں سوویٹ یونین کے بھارت اور عراق کے ساتھ جنگی معاہدہ اور پھر سوویٹ یونین کی

زیر سرپرستی مشرقی پاکستان پر بھارتی قبضے کے بعد کائناتِ ارضی کے اس خطے میں کیمونسٹوں کی سرگرمیاں پھر تیز ہو گئیں۔ اور انہوں نے عظیم تر بلوچستان جس میں ایرانی بلوچستان بھی شامل ہے کا شوشہ چھوڑنے کے ساتھ ساتھ خشکی کے راستے بحر ہند تک پہنچنے کے لئے ایک بار پھر ایران پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔[1]

بعد کے برسوں میں کیمونسٹ پروپیگنڈے کے زیر اثر امریکہ کے خلاف نفرت و عداوت انتہا پر پہنچ گئی۔ شاہ کو امریکی مفادات کا نقیب اور اس کا ایجنٹ قرار دے دیا گیا۔ پورے ملک میں اس کے خلاف ایک وسیع اور منظم تحریک چلی جس نے بالآخر شاہ کو سبکدوش اور جلاوطن ہونے پر مجبور کیا۔

بلاشبہ امریکہ ایک سامراجی قوت ہے۔ اور ہر دوسرے سامراج کی طرح استحصال اس کی فطرت میں بھی داخل ہے۔ لیکن امریکہ اور ایران کے باہمی تعلقات میں امریکہ نے ایران کا کتنا استحصال کیا اور ایران کو امریکہ دوستی میں کیا کچھ ملا؟ یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے۔ جس میں کسی ایک جانب کو ترجیح دینے کے لئے کافی شواہد کی ضرورت ہے۔ تاہم ایک سرسری جائزے میں سب سے اول اور اہم حقیقت، جو ایرانیات پر ہمدردی سے غور کرنے والے کو بہت بڑی حد تک متاثر اور ملول کر دیتی ہے وہ جغرافیائی لحاظ سے ایران کا "فی الوقت خطرناک محل وقوع" ہے۔ وہ ایک ایسے اژدہے کی زد میں پڑا ہے جو برابر اپنی کنڈلی کا دائرہ پھیلاتا جا رہا ہے اور ناتوانوں کو نگلنے میں کسی ضابطے یا قانون کا پابند نہیں ہے۔ مشرقی دنیا کو اپنا جزو بدن بنانے کے لئے اپنے قریبی مشرقی پڑوسیوں کو ہڑپ کرنا نہ صرف اس کی چھپی آرزو ہے بلکہ استعماری عزائم کی تکمیل کے لئے اس کی ایک ناگزیر ضرورت بھی ہے۔ ایران، افغانستان اور پاکستان اس کے مشرقی سرحدوں واقع وہ سلطنتیں ہیں جو ہمیشہ سے اس کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی ہیں۔ یہ علاقے نہ صرف اپنے قدرتی خزائن کی بدولت آپ ہی مطلوب ہیں بلکہ تیل کے بے پناہ ذخائر سے مالا مال شرق اوسط میں داخل ہونے کے دروازے کی حیثیت سے بھی روس کے لئے بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ ان علاقوں کو اپنا حصہ یا کم از کم اپنے تابع مہمل بنانے کے لئے مختلف منصوبوں پر مختلف شکلوں میں مدت سے کام ہو رہا ہے۔ ایران کے سابق حکمرانوں نے انہی سازشوں کے سدباب کی خاطر امریکہ سے گٹھ جوڑ کا راستہ اختیار کیا تھا انہوں نے ایران کے حق میں امریکہ کی جزوی استحصال کو روس کے کلی استیصال پر ترجیح دی تھی اور آثار و قرائن سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ

---

[1] نیا سامراج ص ۱۷۹-۱۸۰

ترجیح صحیح نہیں تھی۔ شاہ کے بعد ایران میں امریکی اثرات مٹانے کے لئے نئی انقلابی حکومت جو کچھ کر رہی ہے یہ اس کا اپنا داخلی مسئلہ ہے۔ جس میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ لیکن امریکہ اور شاہ دشمنی میں اس قدر غلو اور تجاوز کہ اسلامی آداب تک کا پاس و لحاظ نہ کیا جائے۔ نہ صرف یہ کہ اسلامی انقلاب کے علمبرداروں کو زیب نہیں دیتا بلکہ کسی اچھے انجام کی نشان دہی بھی نہیں کرتا۔ امریکہ نے ایران کو موثر فوجی قوت بنانے میں خاصا کام کیا وہ جنوبی ایشیا میں روس کے پھیلتے ہوئے اثر و نفوذ کو روکنے کی غرض سے ایران کو زیادہ سے زیادہ مضبوط دیکھنا چاہتا تھا امریکہ سے قطع تعلق کرنے کے بعد روس کو ایران میں در آنے کے کافی مواقع ہاتھ آئے ہیں نہ جانے انقلابی حکومت نے اس مشکل کا کونسا مادی یا روحانی حل تلاش کر لیا ہے۔ خدا کرے ایران حقیقی معنوں میں اسلام کا گہوارہ بنے اور دوسرے ایشیائی ممالک کے استحکام و تقویت کا ذریعہ ثابت ہو۔

روس اور افغانستان

۱۹۱۹ء میں سٹالن نے کہا تھا کہ

"ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ترکستان کی جغرافیائی حیثیت نے ترکستان کو ایک ایسے پل کی شکل دے رکھی ہے جو سوشلسٹ روس کو مشرق کے غلام ممالک سے ملاتا ہے لہٰذا ترکستان میں سوویٹ نظام کا قیام اور استقرار مشرق کے اندر انقلابات کو وسعت پذیر رکھنے کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مشرق کے اندر سوویٹ نظام کا قلعہ تعمیر کیا جائے اور قازان، اوفا، سمرقند اور تاشقند کے اندر سوشلزم کا لائٹ ہاؤس نصب کیا جائے۔ تاکہ مشرق کی تھکی ماندی اقوام کے سامنے آزادی کی راہیں روشن کرے"[1]

ترکستان کی اس حیثیت اور اہمیت کے پیش نظر روس نے اس کو حاصل کرنے کے لئے بے شمار خون ریز جنگیں لڑیں۔ ترکستان کو ہضم کرنے کے بعد بعینہٖ یہی حیثیت افغانستان کی طرف منتقل ہو گئی۔ چنانچہ یہ پسماندہ علاقہ کئی سالوں سے روس کی ہوسناک نگاہوں کا مرکز بنا رہا۔ امان اللہ خان کی وساطت سے افغانستان میں داخل ہونے کا راستہ بہت جلد ہی مسدود ہو گیا۔ نام نہاد ترقی کے شیدائی اس روس نواز حکمران کو بہت جلد ہی ملک بدر ہونا پڑا۔ اس کے بعد حبیب اللہ خان بچہ سقہ کابل کے تخت پر قابض ہوا۔ نادر خان نے اس کے خلاف افغانستان کی مشرقی سرحدوں سے ملحق آزاد وزیری قبائل کی حمایت و امداد حاصل کی اور بچہ سقہ سے حکومت لینے میں کامیاب ہو گیا۔ امان اللہ خان کے بعد روس کو کئی سالوں تک افغانستان کے سلسلے میں بڑے بے تابانہ انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ تا آنکہ نادر خان قتل ہوا۔ اور اس کے بعد اس کا بیٹا محمد ظاہر شاہ تخت حکومت کا مالک بن گیا۔ بلاشبہ وہ ایک مذہبی اور متدین شخصیت کا حامل تھا لیکن روس کی دور رس سیاست کے داؤ پیچ سمجھنے کی صلاحیت سے عاری تھا۔ وہ خود تو بہت کم لیکن اس کے ارکان دولت روسی ڈپلومیسی کا بری طرح شکار ہوئے۔ کئی علاقائی معاہدات اور اس کے ضمن میں روسی اہل کاروں کی افغانستان میں آمد شروع ہو گئی۔ اقتصادیات اور ٹیکنالوجی کے لئے روسی معلمین و ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اور افغان نوجوانوں کو روس کے بڑے بڑے شہروں میں بھیجا جانے لگا۔ جلد ہی اس کا نتیجہ اولاً اخلاقی بگاڑ اور پھر سیاسی انتشار کی صورت میں رونما ہوا۔ تعلیمی اداروں اور مکاتیب میں پڑھنے والے طلبہ روسی الحاد و دہریت سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور یہی متاثرین دوسرے نوجوانوں میں بھی سوشلزم کے لادینی اثرات کو منتقل کرنے کا ذریعہ بنے۔ عوامی حقوق جمہوریت اور ملکی ترقی کے نام پر کئی سیاسی جماعتیں وجود میں آ گئیں۔ اور ملک کے طول و عرض میں ایک نہ ختم ہونے والا دینی اور سیاسی اضطراب پیدا ہوا۔

خلق، پرچم، شعلہ جاوید۔ افغان ملت، مساوات اور تحریک اسلامی اس دور کی سرگرم عمل سیاسی جماعتیں تھیں۔ اول الذکر دونوں پارٹیوں کا تعلق روس سے تھا۔ خلق اولاً "بیدار نوجوان" (ویخ زلمئے) کے نام سے موسوم تھی اور انگاران کا ایک ماہنامہ شائع ہوا کرتا تھا۔ سردار داؤد کے ظاہر شاہی دور میں وزیراعظم بن جانے کے بعد اس نے پہلا نام تبدیل کر کے خلق کا نیا نام اختیار کیا۔

۱۹۶۷ء تک افغانستان کے چیدہ چیدہ کمیونسٹ مثلاً غلام محمد غبار۔ دستگیری پنجشیری۔ ببرک کارمل۔ عبدالحکیم شرعی جوزجانی۔ بارق شفیعی۔ سلیمان لائق۔ ڈاکٹر زوغون اور حفیظ اللہ امین وغیرہ سب نور محمد ترکی کے زیر قیادت خلق میں کام کر رہے تھے۔ ازاں بعد ببرک کارمل نے میر اکبر خیبر۔ شرعی جوزجانی۔ دستگیر پنجشیری اور کئی دوسرے رفقا کے ساتھ خلق سے علیحدگی اختیار کی۔ اور پرچم کے نام سے ایک الگ جماعت اور اسی نام سے ایک جریدہ کا اجراء کیا۔ ڈاکٹر فیضان، اناہیتا۔ نور احمد نور۔ بارق شفیعی اور سلیمان لائق بھی اس

---

[1] کلیات سٹالن مطبوعہ ماسکو ۱۹۴۷ء جلد ۴ ص ۲۳۸ - ۲۳۹

جماعت کے مرکزی ارکان میں محسوب ہوتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد بارق شفیعی اور سلیمان لائق دوبارہ خلق میں چلے گئے۔ خلق میں اندرونی طور پر بھی کافی اختلافات موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مختلف لیڈروں کے حامی مختلف گروپوں سے یاد کئے جاتے تھے۔ مثلاً زرغون گروپ۔ ترکئی گروپ۔ امین گروپ وغیرہ۔ کچھ عرصے کے بعد خلق اور پرچم میں دوبارہ اتحاد ہوگیا۔ اور دونوں نے وزارتِ عظمٰی سے سبکدوش ہونے کے بعد سردار داؤد کی بھرپور مدد کی۔ چنانچہ انہی کی حمایت و اعانت سے وہ افغانستان کا تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔[1]

شعلۂ جاوید بھی نظریاتی اعتبار سے کمیونزم کی علمبردار تھی اس کا تعلق چین سے بتایا جاتا ہے۔ ظاہر شاہ کے دورِ حکومت میں یہ گروہ اکرم یاری اور صادق علی کی سرکردگی میں کام کر رہا تھا۔ رحیم محمودی کی ادارت میں شعلۂ جاوید ہی کے نام سے ان کا ایک رسالہ نکلا کرتا تھا۔ اس پارٹی کا ایک نہایت سرگرم رکن عثمان لنڈئے تھا۔ یہ جماعت بھی بالآخر کئی دھڑوں میں بٹ گئی۔ اور سردار داؤد کی آمد کے بعد تو تقریباً ختم ہوگئی۔

افغان ملت۔ افغان قوم پرستوں کی جماعت تھی۔ اس کا قائد غلام محمد فرہاد تھا۔ جو نسلاً تو افغانی تھا لیکن جرمنی میں تحصیل کر چکا تھا۔ یہ لوگ پختونستان کے نہ صرف حامی بلکہ سختی سے طلب گار تھے۔ پاکستان نیشنل عوامی پارٹی اور افغانستان کی اس جماعت کے نظریات و رجحانات میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی تھی۔ رفیع اللہ رفیع۔ یوسف میٹرانٹی اور قدرت اللہ حداد اس گروہ کے اہم ارکان تھے۔ یوسف میٹرانٹی نے "نیشنلزم سیکھو" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی جس میں اسلام کے مقابلے میں قومیت کی برتری اور اولیت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام نہیں بلکہ نسل اور کلچر ہی اتحاد کی بنیاد بن سکتے ہیں اگر اسلام فی الواقعہ لوگوں کو اکٹھا اور مجتمع کر سکتا تو ایران، افغانستان اور پاکستان ایک ہوتے۔[2]

مساوات محمد ہاشم میوندوال کی سیاسی جماعت تھی۔ یہ شخص ظاہر شاہی دور میں ایک دفعہ وزیر اعظم بھی رہ چکا تھا۔ ظاہر شاہ کے آخری وزیر اعظم محمد موسیٰ شفیق ان کو گرفتار کرنا چاہتا تھا اسی فکر میں تھا کہ داؤدی انقلاب آگیا۔ خالد روشان اور رحیم الہام کی ادارت میں اس جماعت کا ایک ہفتہ وار اخبار بھی مساوات ہی کے نام سے شائع ہوتا تھا پارٹی اور اخبار امریکی کیپٹیل ازم کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے

---

[1] یعقوب شرافت متعلم مدرسہ نجم المدارس ننگرہار کی غیر مطبوعہ یادداشتیں [2] ایضاً

داؤد نے اپنے دورِ حکومت کے ابتدائی زمانے میں ہاشم کو گرفتار کیا اور کچھ عرصہ بعد اعلان کیا کہ اس نے جیل ہی میں خودکشی کر لی ہے۔ اس جماعت کے باقی ارکان و کارکن بھی داؤدی حکومت کے معتوب رہے اور اور اس طرح سے یہ جماعت بھی ختم ہوگئی۔ خالص اسلامی اقدار و روایات کی علمبردار تحریک اسلامی کسی خاص قائد کے تحت کام نہیں کر رہا تھا ملک کے علماء اور دیندار طبقہ لادینی اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً جمع ہوتے اور غیر منظم انداز سے عوام الناس کی رہنمائی کرتے۔ "گھنیر" "منہاج الدین" کی ادارت میں نکلنے والا واحد ہفت روزہ تھا جو خالص اسلامی افکار کی اشاعت میں کوشاں رہتا۔ یہی رسالہ تحریک اسلامی کا قدرتی ترجمان اور پشتی بان کی حیثیت رکھتا تھا۔ مولوی عبد الرب احدی وردگ، خاتول مولوی محمد یونس خالص اس جریدے کے جز وقتی معاون اور قلمکار تھے۔ مقامی کمیونسٹ گھنیر کے موثر کردار سے کافی حد تک نالاں و پریشان تھے چنانچہ انہی کی سازش سے مدیر منہاج الدین کو ۱۹۷۲ء کی ایک رات میں شہید کر دیا گیا۔ چونکہ قاتلوں کی تلاش اور قرار واقعی سزا دینے کے سلسلے میں ظاہر شاہ حکومت نے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی کے متعلقین ظاہر شاہ کو اس قتل میں ملوث سمجھتے ہیں۔ منہاج الدین کی شہادت کے بعد گھنیر مولوی عبد الرب اور لعل محمد الیاس خیل کی کوششوں سے بدستور جاری رہا۔ تا آں کہ سردار داؤد نے اس پر پابندی لگا دی۔[1]

اس کے علاوہ کاروان اور ترجمان بھی افغانستان کے جانے پہچانے جریدے تھے۔ اول الذکر عبد الحق والہ کی ادارت میں نکلا کرتا تھا۔ عبد الحق ظاہر شاہی دور میں جاسوسی کے الزام میں کچھ عرصہ تک محبوس بھی رہا یہ شخص روس کے مقابلے میں امریکہ کی طرف مائل بتایا جاتا ہے۔ ثانی الذکر عبد الرحیم نوین کی سرپرستی اور بشیر ہروی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ عبد الرحیم نوین داؤدی دورِ حکومت میں وزیر اطلاعات مقرر ہوئے اور کمیونسٹ انقلاب کے بعد جیل میں گئے۔ چونکہ داؤدی انقلاب خلق اور پرچم کی شہ پر کامیاب ہو سکا تھا اس لئے اس کا حقِ نمک ادا کرنے کے لئے داؤد نے اپنے دورِ حکومت میں اولاً ان کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ بالخصوص پرچم کے کئی زعماء مثلاً باختری۔ فیض محمد وغیرہ کو اچھے اچھے عہدے تفویض کئے۔ خلق افغانستان میں لینن ازم کی علمبردار تھی۔ جریدہ خلق کے شمارہ ۱،۲ دوشنبہ ۲۲ حمل ۱۳۴۵ھ مطابق

---

[1] حوالہ سابق۔

۱۱ اپریل ۱۹۶۶ء کے بموجب، وہ اشتراکی نظام کا قیام اور سرمایہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ چاہتی ہے۔ اختیاراتِ حکومت کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عوام کی طرف منتقل کرنے کی خواہاں ہے۔ تحریر و تقریر اور ہر قسم کے جلسے جلوسوں سے پابندی اٹھوانا اس کے ابتدائی مقاصد میں داخل ہے۔ افغانستان کے تمام باشندوں کو مساوی حقوق دلانا بالخصوص عورتوں کی آزادی اور اس سلسلے میں عائد تمام دینی اور معاشرتی پابندیوں کو ختم کرانا بھی خلقی منشور کے اساسات میں سے ہے۔ پختونستان کی بازیابی اور ڈیورنڈ لائن کو توڑ کر اٹک تک افغانستان کی توسیع خلق کا سب سے اہم اور بڑا سیاسی نصب العین ہے۔ الغرض یہاں ان تمام دلفریب مطالبات کا ذکر موجود ہے جو اشتراکیت کا راستہ ہموار کرنے میں ممد و معاون ہیں۔ خلق اور پرچم کے ترجمان جریدے اکثر و بیشتر اسلام کے خلاف اور اشتراکیت کے حق میں بڑے دل آزار قسم کے مضامین بھی شائع کرتے تھے۔ ایک دفعہ تو جریدہ پرچم نے لینن کو خدا کا ہم مرتبہ اور قابل درود و سلام ظاہر کیا۔ بارق شفیع نے لینن کی توصیف میں یہ شعر کہا ہے

خلاق باشکوہ و جہاں سازِ بےمثال انماہزار درود بر آں لینن کبیر

اس گستاخی پر مسلمانوں میں کافی ہل چل مچی۔ اور حکومت کو نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے سخت قسم کے اقدامات کرنے پڑے[1]

روسی حکومت ظاہر شاہ کو پختونستان کے مسئلے پر پاکستان سے الجھانے کی ہزار کوششیں کرتی رہی لیکن وہ برادر اسلامی ملک سے کسی طور پر بھی الجھنے کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ اس سے مایوس ہو کر روس نے سردار داؤد کو آگے لانے کی کامیاب کوشش کی۔ چنانچہ جولائی ۱۹۷۳ء میں ظاہر شاہ کا تختہ الٹ دیا گیا اور سردار داؤد نئے حکمران کی حیثیت سے افغانستان کے تخت پر متمکن ہوئے۔ اس نے اپنی پہلی نشری تقریر میں پاکستان کو دنیا کا وہ واحد ملک قرار دیا جس سے افغانستان کا تنازعہ ہے۔ جس طرح سردار داؤد کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں پاکستان کے خلاف کابلی پروپیگنڈہ تیز ہو گیا تھا۔ ان کے جمہوریہ افغانستان کا صدر بن جانے کے بعد پاکستان کے مخالف عناصر اور علیحدگی پسند پختون ٹولہ کے ارکان پھر سے کابل میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔

---

[1] حوالہ سابق

سردار داؤد اور خلق و پرچم کے درمیان زیادہ دیر تک نباہ نہ ہو سکا۔ جلد ہی ان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ تاہم ملک کے چپے چپے میں آمادۂ عمل اسلامی قوتوں کو ان کے خلاف کھل کر آنے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ سردار داؤد کے دورِ حکومت کے آخری ایام تک خلق و پرچم کو ہر قسم کا تحفظ حاصل رہا۔ نہ جانے سردار کو کیا سوجھی کہ چند مشرقی ممالک کا دورہ کرنے کے بعد اچانک ہی بدل گئے۔ اور روسی پالیسیوں کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ غالباً اس کی غیرت زیادہ دیر تک کفر کا آلۂ کار بننا برداشت نہ کر سکی[1]

۱۸ اپریل ۱۹۷۸ء کی رات کو پرچم کا رہنما میر اکبر خیبر قتل ہوا۔ حفیظ اللہ امین نے پہلے ہی سے افغان فوج میں کام شروع کیا ہوا تھا۔ اور اب تک فوج کے کئی بڑے بڑے افسروں مثلاً ڈگروال عبدالقادر اور جگرمن محمد اسلم وطن جار کو اپنا ہم نوا بنا چکا تھا۔ خلق و پرچم کے تمام ارکان اور متاثرین نے خیبر کے جنازے میں شرکت کی اور داؤد کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ ۲۶ اپریل ۱۹۷۸ء کو خلق و پرچم کے اکثر لیڈر گرفتار کر لئے گئے اور رات کو داؤدی حکومت کی جانب سے ان کی گرفتاری کا اعلان ہوا۔ ۲۷ اپریل کو فوج بالخصوص فضائیہ نے داؤدی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ اور دارالحکومت کابل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کہا جاتا ہے کہ بغاوت کی کارروائی میں روسی فضائیہ نے براہ راست حصہ لیا۔ اور اس طرح اپنی روایات کے عین مطابق سوشلزم نے ایک انتہائی خون ریز انقلاب کے ذریعے افغانستان کا تخت حاصل کیا۔ خلق کے قائد نور محمد ملک کے نئے حکمران بنے اور پورے ملک میں علماء اور دیندار طبقے کو عوام دشمنی کے الزام میں گرفتار اور قتل کیا جانے لگا۔[2]

اب افغانستان میں سوشلزم کے عملی نفاذ اور اس کے مخالفین کی سرکوبی کا وقت آ پہنچا تھا۔ چنانچہ سوشلسٹ حکومت نے اس مقصد کے حصول میں بڑی گرمجوشی اور پھرتی دکھانی شروع کی۔ افغانستان کی ۹۹ فیصد مسلمان آبادی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے ایک طرف پاکستان اور ایران کے اسلامی ممالک کی طرف ہجرت کرنی شروع کر دی اور دوسری طرف اسلام کے دفاع میں جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز کر دیا۔ ملک کا قریہ قریہ کمیونسٹ حکومت کے خلاف کارروائیوں کا اڈہ اور مجاہدین کا مرکز بن گیا۔ حالات پر قابو پانے کے لئے کمیونسٹوں نے پھر سے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بیانات دیے اور ذرائع ابلاغ کو اسلام کی مدح و توصیف اور حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ایجنٹ ثابت کرنے کے

---

[1] حوالہ سابق [2] ایضاً

لئے وقف کیا۔ اس پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ضمیر و ایمان خریدنے کا سلسلہ جاری رہا۔ دین کے پکے اور غیور افغانوں میں اگرچہ ان کی یہ فریب کاریاں خاطر خواہ نتائج نہ پیدا کرسکیں تاہم مطلقاً بے اثر بھی نہ رہیں۔ ترکئی حکومت افغانیوں کا اعتماد حاصل کرنے میں بُری طرح ناکام ہو رہی تھی اور مجاہدین کا جوشِ جہاد روز افزوں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ خود برسرِ اقتدار گروہ کے اندر بھی ناقابلِ مفاہمت پھوٹ پڑ چکی تھی۔ اور اس کے ارکان ایک دوسرے سے بدظن ہو چلے تھے۔ اندریں حالات کابینہ کے ایک وزیر حفیظ اللہ امین نے ایک خون ریز جھڑپ میں نور محمد ترکئی کو قتل کر دیا اور ملک کے تمام تر اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ ترکئی کیوں قتل ہوا؟ اس کی اصل وجہ تاہنوز معلوم نہیں ہو سکی۔ اب حکومت نے مجاہدین کے خلاف کارروائیاں تیز تر کر دی ہیں۔ باوجود ہر قسم کی امداد کے مقامی حکومت اس ہمہ گیر بغاوت پر قابو پانے سے عاجز و درماندہ دکھائی دے رہی ہے۔ لہٰذا روس نے براہِ راست مداخلت شروع کر دی ہے۔ بغاوت کچلنے کے سلسلے میں افغان فوج بے بس اور کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ روس کی نگاہوں میں مشکوک بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اہم مقام پر روسی اہل کار تعینات ہیں۔ اور تمام حاکمانہ اختیارات روسی مشیروں کے ہاتھ میں ہیں۔

افغانستان کے مسلمان بڑی بے سروسامانی سے اس عظیم سامراج کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ انسانیت کی بہی خواہ اور امن و آشتی کا مدعی روس مولی گاجر کی طرح ان کے گلے کاٹ رہا ہے۔ اور پانی کی طرح ان کا خون بہا رہا ہے۔ لیکن دنیا کی کوئی طاقت ان مظلوموں کی آہ و بکا سننے کے لئے تیار نہیں جس کو بھی اس طرف متوجہ کیا ان کی جائز امداد کرنے سے ہچکچاتا نظر آیا۔ نہ جانے کب تک ظلم و ستم کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور انجام کار اس دھرتی کے مسلمانوں کا کیا بنے گا؟

پاکستان ــــ سوشلزم کا راہ گزر!

پاکستان دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت اور یہ دنیا کا واحد ملک تھا جو اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا۔ سوویٹ لیڈر پاکستان کی تشکیل ہی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور انہیں یہ خدشہ تھا کہ یہ نئی اسلامی مملکت وسطی ایشیا کی محکوم اقوام میں بیداری و آزادی کی کسی تحریک کے لئے تقویت کا موجب بن سکتی ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان روس کے توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے اس لئے اس کا مستقل وجود روس کو بڑا شاق اور ناگوار گذر رہا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ میں روس کی دلچسپی کا آغاز پیٹر دی گریٹ کے زمانے میں ہی ہو گیا تھا۔ زار پیٹر نے اپنا خاص ایلچی ایران بھیجا تھا۔ اس ایلچی کا مشن تھا کہ ایران اور خلیج فارس کے علاقے میں روس کے لئے خاص مراعات حاصل کی جائیں۔ یہ مشن کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔ اور اس کے بعد روسی حکمران داخلی مسائل میں الجھنے کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ دے سکے۔ دوسری جنگ عالمگیر کے دوران بحر ہند اور خلیج فارس کے علاقوں میں روس کی دلچسپی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ چنانچہ روس پر جرمنوں کے حملے سے ایک سال پیشتر برلن میں ہٹلر اور مالوٹوف کے مابین ایک کانفرنس ہوئی جس میں جرمن آمر نے مستقبل کے سوویٹ حلقہ اثر و نفوذ" کے تعین کے ضمن میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ماسکو اپنی توجہ کا مرکز و محور بحرِ ہند کے علاقوں کو بنانا چاہئے۔ اس وقت ماسکو حکومت کے لئے بلقان اور ترکیہ تشویش و اضطراب کا موجب بنے ہوئے تھے۔ ماسکو کے حکمرانوں نے اس تجویز کو "دور کے ڈھول" اور "ہوائی قلعہ" سے تعبیر کرتے ہوئے یہ جوابی تجویز پیش کی۔ کہ وہ آبنائے باسفورس میں فوجی اور بحری اڈہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اپنا حلقہ اثر باکو سے جنوب کی جانب خلیج فارس کی طرف بڑھانا چاہتا ہے۔ جرمنوں نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ لیکن ان "نازی سوویٹ مذاکرات" سے ایران۔ ترکیہ اور آبنائے باسفورس میں روس کی روایتی دلچسپی کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے جو عزائم پیٹر دی گریٹ کے بعد سوتے ہوئے تھے وہ موقع ملنے پر کس طرح بیدار ہو گئے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سٹالن نے مشرق وسطیٰ کی جانب توسیع کا خیال وقتی طور پر ذہن سے نکال دیا کیونکہ اینگلو امریکی محور اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔[1]

اس کے بعد سوویٹ یونین کے سامنے صرف بحیرہ روم کے مشرق کی جانب اثر و نفوذ کی توسیع کا راستہ رہ گیا۔ چنانچہ اس نے تین سابق اطالوی نو آبادیات ــــ ساحل اناطولیہ کے قریب تین جزائر۔ لیبیا کا کچھ حصہ اور اری ٹیریا میں تولیتی طاقت بننے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ حکومت نے دوسری جنگ عالمگیر کے بعد مالِ غنیمت کے طور پر اطالوی بحریہ کا ایک تہائی حصہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بحیرہ روم میں اپنا بحری بیڑہ رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ سب کوششیں رائیگاں گئیں۔ جنگ نے برطانیہ کو خاصا کمزور اور مضمحل کر دیا تھا۔ چنانچہ برطانوی حکومت کی یہ کوشش تھی کہ امریکہ بحیرہ روم کے علاقے میں آ جائے

---

[1] نہاسارہ ۵ ص ۲۲۳

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ بحیرہ روم کی ایک طاقت بن کر ابھرا۔ اور یونان و ترکیہ مغربی دفاعی نظاموں میں شریک ہو کر امریکہ کے تحفظ میں آ گئے۔ سٹالن بحیرہ اسود میں سمٹنے پر مجبور ہو گیا۔ اور اس کے جانشینوں نے ترکیہ کے بعض علاقوں پر اپنا سابقہ دعویٰ اور فوجی اڈوں کے لئے جگہ کا مطالبہ بھی واپس لے لیا۔[1]

سٹالن کے جانشینوں کو اپنے پیش رو کے مقابلے میں زیادہ مشکل صورتِ حال کا سامنا تھا ان کے مغرب میں "نیٹو" (معاہدہ شمالی اوقیانوس) کی دیوار ابھر آئی تھی جو یورپ کی جانب ان کی توسیع میں مزاحم تھی۔ جنوب میں معاہدہ بغداد کی جگہ "سنٹو" کی تنظیم معرضِ وجود میں آ چکی تھی۔ نیٹو کو ایٹمی تحفظ بھی حاصل تھا۔ لہٰذا سوویٹ حکمرانوں نے اگرچہ اس کے مقابلے میں اپنی یورپی نوآبادیات کو احساسِ تحفظ سے سرشار کرنے کے لئے "وارسا پیکٹ" کا اہتمام کر لیا تھا۔ لیکن وہ نیٹو کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بہر حال نہیں کر سکتے تھے۔ بہرکیف وہ "سنٹو کی زنجیریں" توڑنے کے لئے سیاسی اقدامات کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ پاکستان سنٹو کا واحد رکن تھا۔ جسے اس کے دو ہمسایوں — بھارت اور افغانستان — کے پیدا کردہ مسائل نے گھیر رکھا تھا۔ خروشیف اور بلگانن نے پاکستان کو سنٹو سے نکلنے پر مجبور کرنے کے لئے ان مسائل کو استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان دونوں لیڈروں نے ۱۹۶۰ء میں اپنے دورہ بھارت کے دوران اپنی تقاریر میں نہ صرف کشمیر کے تنازعہ پر پاکستان کی مخالفت کی بلکہ برصغیر کی تقسیم کو بھی "عوامی مفاد" کے منافی اور تیسری طاقت برطانیہ کی چال قرار دیا۔ خروشیف نے تو اپنی سرینگر کی تقریر میں صاف کہہ دیا۔ کہ بلگانن اور وہ پاکستان کی اس لئے مخالفت کر رہے ہیں کہ پاکستان معاہدہ بغداد میں شامل ہے۔ پاکستان نے ان تقاریر کے خلاف احتجاج کیا لیکن اس کے باوجود یہ دونوں سوویٹ لیڈر دہلی سے کابل پہنچے تو انہوں نے ایک عشائیہ میں تقریر کرتے ہوئے "پختونستان" کی حمایت کی۔ اس عشائیہ میں افغان وزیر اعظم سردار داؤد خان بھی موجود تھے جو بعد میں اقتدار پر قابض ہو گئے۔[2]

پاکستان کو توڑنے اور کمزور کرنے کے لئے روس نے کیا کیا حربے اختیار کئے ہیں اس کا ایک ہلکا سا اندازہ پاکستان کے مشہور شاعر حفیظ جالندھری کے اس انکشاف سے ہوتا ہے جو اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ایفرو ایشین رائٹرز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے روس کا دورہ کرنے کے بعد اُس نے کیا۔ سیارہ ڈائجسٹ کے شمارہ اپریل

---

[1] حوالہ سابق ص ۲۲۴، ۲۲۵ [2] ایضاً

۱۹۷۳ء میں اس کے دورۂ روس کا وہ حصہ شائع ہوا ہے جس میں اُس نے خروشیف سے ملاقات کی۔ حفیظ کا بیان ہے کہ

کامریڈ خروشیف مجھ سے کہنے لگے — میں جانتا ہوں کہ آپ پاکستان کے بہت بڑے شاعر ہیں اور آپ کو شاعرِ اسلام کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ حکومت پاکستان نے آپ کو منتخب کر کے بھیجا ہے میں حیران تھا کہ اب مجھ سے کیا توقع کی جا رہی ہے۔ فرمانے لگے۔ پاکستان کا تعلق سارے اسلامی ملکوں سے ہے۔ امریکہ اور انگریز ان کے درمیان تفرقہ ڈالنے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ آپ شاعر ہیں اس لئے آپ کو چاہیے کہ زیادہ تر افغانستان کے ساتھ دوستی قائم کرنے کی ہیلپ کریں۔ اس سے افغانستان مضبوط ہوگا۔ اور ساتھ ہی اس کا اثر ایران اور ترکی پر بھی پڑے گا اور ان سب کا اثر آپ پر (پاکستان) اور ایران پر بھی پڑے گا۔ آپ لوگوں کو ہندوستان سے اپنے جھگڑے ختم کر دینے چاہئیں۔

میں نے کہا — جناب جھگڑا پاکستان نہیں، ہندوستان کر رہا ہے۔ ہم تو پہلے ہی سے افرو ایشین قرارداد پر چل رہے ہیں۔ کہنے لگے — ٹھیک ہے لیکن روس چاہتا ہے کہ آپ کی مدد کی جائے اور وہ اس طرح کہ دریائے چناب جہاں سے نکلتا ہے اور جن پہاڑوں سے گذرتا ہوا مغربی پاکستان میں داخل ہوتا ہے اور پھر پنجاب اور سندھ سے ہوتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے یہاں تک کا سارا علاقہ پاکستان کو افغانستان کے حوالے کر دینا چاہئے خواہ اس کا نام پختونستان رکھا جائے یا افغانستان یا کچھ اور — اس طرح آپ لوگ قوی ہو جائیں گے۔

میں نے پوچھا — اور باقی

جواب ملا۔ بھارت کے سپرد کر دینا چاہئے۔ وہاں سوویٹ بنائے جائیں گے۔ راجپوتانے کے بھی تین سوویٹ زبانوں کے اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے بنائے جائیں۔ سندھ کو بمبئی سے ملا دیا جائے باقی رہا کشمیر — وہ تو بھارت کو مل ہی چکا ہے۔

میں نے پوچھا —

کامریڈ اس سلسلے میں مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔

کہنے لگے۔

آپ وفد کے لیڈر ہیں آپ کو ایک دنیا سُنتی ہے آپ ثقافتی سربراہی قبول کریں اور پاکستان

جسے انگریزوں نے روس کے خلاف لکیر کھینچ کر بنایا ہے۔ انگریزوں اور امریکیوں کو شکست دینے میں ہماری مدد کرے۔ اور خود افغانستان سے مل کر اپنی طاقت میں اضافہ کرے۔

آپ کی ڈسپوزل پر تیس لاکھ روپیہ رکھ دیا جائے گا۔ فیض صاحب اور دوسرے جو یہاں کام کرنے کے لئے متعین کئے جائیں گے ان کی نگرانی آپ کریں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ دوسری جنگ عظیم میں ڈائریکٹر سائکلوجی کی حیثیت سے پورے ہندوستان پر حاوی رہے ہیں لیکن وہ مدد انگریزوں کے لئے تھی جو آپ کو کھا جانا چاہتے تھے۔ ہم تو آپ کی عزت بڑھانا چاہتے ہیں میں ہکا بکا ان کا منہ تک رہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا۔ کامریڈ کو کوئی اور کام تھا اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا — کل آپ کریملن کی سیر کریں اور ہمارے اس منصوبے پر بھی غور فرمالیں[1]

سیارہ کے اس لمبے اقتباس سے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ پاکستان کے اندرونی انتشار و خلفشار اور نظریاتی عدم استقرار پیدا کرنے کے لئے روسی حکمران جب حفیظ جیسے "پاکستانی" کو بھی استعمال کرنے کی فکر میں ہیں تو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ان لاتعداد مار آستینوں کو کس کس انداز سے استعمال کیا جا چکا اور کیا جا رہا ہوگا جو ملک و ملت فروشی کو ننگ و عار نہیں بلکہ سیاست کا کمال سمجھتے ہیں۔

۱۹۶۰ء کی پاک چین دوستی کے بعد سوویٹ لیڈر یہ بھی سوچنے لگے کہ اس دوستی کا وسطی ایشیا کی مسلم اقوام پر ناگوار اثر پڑ سکتا ہے۔ اور ان کی توجہ کا مرکز سوویٹ یونین کی بجائے چین بن سکتا ہے۔ اس سے پہلے سوویٹ لیڈروں نے بھارت کے ساتھ تو گہرے دوستانہ روابط استوار کئے تھے لیکن پاکستان کو وہ ہمیشہ حقارت کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان کے نزدیک پاکستان برطانوی استعماریت کی اختراع اور امریکہ کی نوآبادی تھا۔ چین اور بھارت کے مابین جب اختلافات رونما ہوئے اور باہمی کشیدگی ۱۹۶۲ء میں زبردست سرحدی جنگ کی صورت اختیار کر گئی اور اس سرحدی جنگ میں پاکستان غیر جانب دار رہا تو سوویٹ لیڈروں کا رویہ بھی قدرے تبدیل ہو گیا اور ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں سوویٹ حکومت نے مصالحت کنندہ کا کردار سرانجام دیا۔[2]

بھارتی حکمرانوں کے نزدیک اب روسی پالیسی پہلے کی طرح بھارت کے زیادہ موافق نہیں تھی۔ پہلے سوویٹ زعماء بھارت کے بہت قریب تھے وہ سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر اپنا حق تنسیخ (ویٹو) استعمال کر کے بھارت

---

[1] سیارہ ڈائجسٹ شمارہ اپریل ۱۹۷۳ء [2] نیا سامراج ص ۱۹۴، ۱۹۵

کے موقف کو تقویت پہنچاتے تھے۔ اب ان کی نظروں میں پاکستان اور بھارت یکساں تھے۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی۔ مسز اندرا گاندھی وزیراعظم بننے کے کچھ عرصہ بعد بھارتی حکمران اپنے بیانات میں سوویٹ یونین کی بڑی فراخدلی سے تعریف، تشکر اور ممنونیت کا اظہار کرنے لگے تھے اس کے ساتھ ہی ساتھ امریکہ اور اس کے یورپی حلیفوں پر نقد و جرح میں اضافہ ہونے لگا۔ بھارت کو سوویٹ یونین سے جو اقتصادی امداد ملتی تھی وہ امریکہ سے ملنے والی امداد کا عشر عشیر بھی نہیں تھی۔ لیکن جدید ترین اسلحہ کی بہم رسانی میں روس سرفہرست تھا۔ مسز اندرا گاندھی نے روس نواز کمیونسٹ پارٹی کی داخلی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے نیز اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لئے روس سے زیادہ اسلحہ ملنے کی امید پر سوویٹ لیڈروں سے محبت کی پینگیں بڑھانی شروع کیں۔ اور ان سب کی توہین کو شعار بنایا جنہیں ماسکو والے پسند نہیں کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوویٹ لیڈر بھارت پر پھر مہربان ہو گئے۔ صدر پڈگورنی اور دوسرے روسی زعماء نے پاکستان کے داخلی و سیاسی مسائل کے بارے میں ایسے بیانات دئے جو کھلم کھلا مداخلت کی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ بیانات بھارت کو مطمئن کرنے کے لئے تھے۔ انہوں نے بھارت کو ہر قسم کی فوجی امداد دی اگست ۱۹۷۱ء میں بھارت اور روس کے درمیان ایک فوجی معاہدہ بھی ہوا اور روس کی ان مہربانیوں اور نوازشوں کی وجہ سے بھارت کو پاکستان کے ایک حصے میں تخریب و سازش کا جال پھیلانے اور پھر عریاں جارحیت کے ذریعے مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے کی شہ ملی۔ پاکستان نے اپنی سرحدوں پر حملہ کے ردعمل کے طور پر مغربی سرحدوں پر پیش قدمی شروع کی تو روس نے افغانستان کے راستے اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے چند گھنٹوں میں پشاور تک پہنچ جانے کی دھمکی دی اور رہے سہے پاکستان کی تباہی کا بھی خطرہ پیدا ہو گیا۔[1]

سوویٹ یونین کے توسیعی منصوبوں میں پاکستان کو نمایاں حیثیت کیوں حاصل ہے؟ اس کی ایک وجہ تو ازیں پیشتر بیان کی جا چکی ہے کہ اسلام کی بنیاد پر معرض وجود میں آنے والا پاکستان کسی وقت بھی وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی کسی تحریک آزادی کے لئے باعث تقویت بن سکتا ہے۔ اس کی بعض اور اہم وجوہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ دوسری جنگ عالمگیر کے بعد سوویٹ یونین کے حکمران آبنائے باسفورس اور بحیرہ روم کے ساحل کے ساتھ اپنے بحری اڈے قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کی یہ خواہش اتحادیوں نے پوری نہ کی لیکن عربوں اور اسرائیل کی آویزش کے طفیل وہ اسکندریہ میں اپنا بحری اڈہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب بحیرہ روم میں امریکہ

---

[1] نیا سامراج

کے مقابلے میں سوویٹ یونین کے جہازوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں سوویٹ یونین مشرق قریب (بالواسطہ مشرق وسطیٰ) میں داخل ہوگیا ہے۔ اور بحیرہ روم کی طاقت کی حیثیت حاصل کرلی ہے اب وہ مشرقی بحیرہ روم کی بجائے مشرق وسطیٰ پر اپنی توجہ دینا چاہتا ہے۔ پاکستان اس راستے میں حائل ممالک میں سے کمزور ترین ملک ہے۔ چنانچہ وہ اسی کو رام کرکے مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے۔

۲۔ سوویٹ یونین نے افغانستان کو حلیف بنانے کے بعد خشکی کے راستے بحر ہند تک رسائی نیز پاکستان کے مشرق وسطیٰ سے ملحق شمال مغربی علاقوں (جو کہ سڑکوں کے ذریعے خلیج فارس اور بحر ہند سے منسلک ہیں) میں بالادستی حاصل کرنے کی مساعی تیز تر کردی ہیں۔ پختونستان کا ڈھونگ جو افغانستان نے ۱۹۴۷ء سے رچایا ہوا ہے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

۳۔ پاکستان نے چین کے ساتھ قدیم شاہراہ ریشم دوبارہ کھولنے کی غرض سے درۂ قراقرم میں ہر موسم میں قابلِ استعمال سڑک کی تعمیر کی جو شمالی پاکستان کو جنوبی چین سے ملاتی ہے اس طرح چین کو بحر ہند، خلیج فارس، بحیرہ عرب اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں تک رسائی کی سہولت حاصل ہوگئی۔ اس پر سوویٹ یونین خفا و برہم ہوگیا۔ اور اپنے لئے اسی نوعیت کی سہولت پر اصرار کرنے لگا۔ چنانچہ سابق صدر ایوب خان کے آخری ایام میں سوویٹ یونین نے پاکستان کو یہ تجویز پیش کی کہ تاشقند و سمرقند (سوویٹ یونین) سے قندھار (افغانستان) تک موجودہ سڑک کو چمن کے راستے بحیرہ عرب کی کسی بندرگاہ تک توسیع دینے کی اجازت دی جائے (پاکستان کے مکران کے ساحل پر گوادر، پسنی، جیونی، ارمارہ اور سونمیانی پانچ ایسی بندرگاہیں ہیں جنہیں ترقی دی جاسکتی ہے ان میں سے گوادر سب سے بڑی ہے۔ سوویٹ حکمران گوادر یا پسنی تک سڑک تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ یہ دونوں بندرگاہیں خلیج فارس کے قریب ترین ہونے کی وجہ سے فوجی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں اور بڑی طاقتوں کی کسی آویزش کی صورت میں بڑی کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں۔ پاکستان نے یہ تجویز مسترد کردی۔ اس سے سوویٹ یونین مزید خفا ہوگیا۔ اور پاکستان کے دیرینہ دشمنوں (بھارت اور افغانستان) کی پہلے سے بھی زیادہ سرپرستی کرنے لگا۔ یہ اسی سرپرستی کا نتیجہ تھا کہ بھارت تخریب و سازش اور عریاں جارحیت کے ذریعے مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

مشرقی پاکستان پر بھارتی قبضہ کے بعد "سوویٹ، افغان بھارتی تثلیث" نے بلوچستان اور سرحد میں علیحدگی پسند عناصر کو ابھارنا شروع کیا ہے۔ اور عظیم تر بلوچستان اور پختونستان کی تشکیل کی مساعی

تیز تر کردی گئی ہیں۔ بلوچی اور پشتو کی اساس پر ان دو آزاد اور خود مختار مملکتوں کا قیام دراصل اس سوویٹ منصوبے کا حصہ ہے جس میں سوویٹ حکمرانوں نے برصغیر کی پانچ لسانی خطوں میں تقسیم کی تھی۔ لیکن بھارت سے گٹھ جوڑ کے بعد وہ صرف پختونستان اور عظیم تر بلوچستان پر اکتفا کرنے لگے ہیں۔

روس، افغانستان اور بھارت دونوں کو پاکستان کی بندر بانٹ پر اکسا رہا ہے اور کوشش کررہا ہے کہ دونوں مملکتوں میں وہ لوگ اقتدار و اختیار پر قابض ہوجائیں جو پاکستان دشمنی میں انتہا پسندانہ عزم و روش رکھتے ہوں۔ افغانستان میں داؤد کو اس لئے نیست و نابود کیا گیا کہ وہ روس کے اس مقصد کے روادار اور وفادار نہیں رہے تھے۔ نیز بھارت میں مرارجی ڈیسائی کی قبل از وقت معزولی کی اصل وجہ بھی یہی خیال کی جارہی ہے کہ وہ پاکستان کے بارے میں روسی منصوبوں کی تائید و حمایت سے کنّی کترا رہے تھے افغانستان کی نئی حکومت روس کے اشارے سے اپنی تمام داخلی مشکلات کے لئے پاکستان کو ذمہ دار ٹھہرا رہی ہے۔ اور مختلف حیلوں بہانوں سے تاک میں بیٹھے ہوئے روسی سامراج کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ جارحیت پیدا کرنے کی سر توڑ کوشش کررہی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے متعدد بار پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ پاکستانی علاقوں کو بمباری کا نشانہ بھی بنایا ہوا ہے۔ گذشتہ دنوں تو اس نے پاکستان کے ایک سفارتی اہل کار متعینہ کابل کو کئی دن تک حبس میں رکھا اور اس سے پاکستان کے خلاف افغانستان میں سیاسی پناہ لینے کا اعلان کرانے کی ناکام کوشش کی گئی۔ تاہم پاکستان غیر معمولی تحمل اور حزم و احتیاط کو اپنائے ہوئے ہے۔ خدا معلوم کب وہ سلگتی ہوئی ایمانی چنگاری بھڑک اٹھے گی جو خرمنِ کفر کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنادے۔

خدایا! ہمیں اپنی مرضیات کی توفیق دے کر اپنی
بے پناہ رحمتوں کا مستحق بنادے!!!



(کتبہٗ محمد عبدالواحد اختر عفی اللہ عنہ)